جوش کی
انقلابی
نظمیں
ڈاکٹر عصمت ملیح آبادی

جوشؔ کی انقلابی نظمیں

مرتبہ

ڈاکٹر عصمت ملیح آبادی

یہ کتاب فخرالدین علی احمد میموریل اُردو کمیٹی کے مالی اشتراک سے شائع ہوئی ہے

ناشر : ڈاکٹر عصمت ملیح آبادی

بہ اہتمام : وائی آسی۔ مکتبہ دین و ادب۔ لکھنؤ

طابع : تنویر پریس۔ لکھنؤ

قیمت : [illegible] روپے

چھاپ : مارچ ۱۹۸۲ء

ملنے کا پتہ

مکتبہ دین و ادب۔ امین الدولہ پارک۔ لکھنؤ

اُن بہادروں کے نام :

جنھوں نے مادرِ وطن کی آزادی کے لئے اپنی جانیں

قربان کر دیں ـــــ

"سنو اے بستگانِ زلفِ گیتی، ندا کیا آ رہی ہے آسماں سے
کہ آزادی کا اک لمحہ ہے بہتر، غلامی کی حیاتِ جاوداں سے"

جوشؔ

حرفِ آغاز

۱۷۰۷ء میں مغل شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے انتقال کے بعد وراثت کی لامتناہی جنگ شروع ہو گئی۔ مغل بادشاہ کمزور ہوئے تو امرائے دربار نے کٹھ پتلی بادشاہوں کو تخت پر بٹھانا، معزول کرنا، قتل کرانا اور اندھا کر کے قید خانوں میں ڈالنا شروع کر دیا۔ صوبوں کے حاکم، خود مختار حکمراں بننے لگے۔ ہندوستان کی متحدہ حکومت ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی اور مختلف ریاستیں صرف اپنے مفاد اور اپنی سیاست کو دیکھنے لگیں۔ ہندوستان کے بارے میں سوچنے کا ڈھنگ بدل گیا کیونکہ اب "ہندوستانی حکومت" نام کی کوئی حکومت باقی نہیں رہ گئی تھی۔

اودھ کے صوبے دار صفدر جنگ نے بھی دہلی کو چھوڑ کر اودھ کو اپنا مرکز بنایا اور اس طرح صوبہ اودھ نیم خود مختار حکومت بن گئی۔ جب اودھ پر انگریزوں کا غلبہ ہونے لگا تو انھوں نے اودھ کے نواب کو شاہ کا خطاب اختیار کرنے کا مشورہ دے کر دہلی کی کمزور حکومت سے رشتہ توڑ لینے کا راستہ دکھایا۔

عہد غازی الدین حیدر اور نصیر الدین حیدر میں اودھ کی راجدھانی لکھنؤ علم و فن اور تہذیب و تمدن کا ایک مرکز بن گئی۔ ایک باحوصلہ اور قسمت آزما پٹھان فقیر محمد خاں گویا ملیح آبادی نے پہلے راجستھان اور ممالک متوسط (مدھیہ پردیش) میں راجپوتوں اور انگریزوں سے جنگ کی اس کے بعد علمی زندگی کو اختیار کر کے اودھ

سے دربار بیٹھ گئے جائے۔

فقیر محمد خاں گویا ناسخ کے ہمعصر اور لکھنؤ کی ادبی محفلوں میں استادی کی مسند پر رونق افروز رہے۔ ملیح آباد میں عالیشان محلات بنائے اور ایک بہت بڑا علاقہ اپنی جاگیر کے نام سے ۱۸۴۲ء کے لگ بھگ "دیوان گویا" اور نثر میں "بستانِ حکمت" چھوڑ کر انتقال کیا۔

ان کے بیٹے محمد احمد خاں کو وراثت میں جاگیر اور شاعری دونوں ملے۔ ان کا دیوان "مخزنِ آلام" ہے۔ غدر کے ہنگاموں سے نکلنے کے بعد ان کی جاگیر محفوظ رہی اور انگریزی حکومت نے انھیں "تعلقدار ملیح آباد" تسلیم کر لیا۔ ان کے باپ فقیر محمد خاں کو جو حکمرانی حاصل تھی وہ کچھ کمتر درجے میں انھیں بھی حاصل ہو گئی۔

محمد احمد خاں کے بیٹے بشیر احمد خاں بشیر بھی خاندانی روایات سے متاثر اور شاعر تھے۔ ان کا مجموعۂ کلام "کلام بشیر" کے عنوان سے جوش کے بڑے بھائی شفیع احمد خاں ولی نے ۱۹۱۲ء میں ملیح آباد سے شائع کیا۔ بشیر احمد خاں، شریف النفس، نیک سیرت، با مروت اور علم دوست انسان تھے۔ اُن کے مکان پر شعراء کی محفلیں رہتی تھیں جن میں، عزیز لکھنوی، آبر لکھنوی، محشر لکھنوی، کلیم لکھنوی، خضر لکھنوی اور طپش رامپوری اکثر شریک رہتے تھے۔

ایسے فوجی، سیاسی، علمی اور ادبی گھرانے میں جوش ملیح آبادی ۱۸۹۶ء میں پیدا ہوئے، آنکھ کھولی تو علم و ادب کی محفلوں کو آراستہ دیکھا، ہوش سنبھالتے ہی نو برس کی عمر میں، اپنے موزوں طبع ہونے کا ثبوت اس طرح پیش کیا ہے ؎

شاعری کیوں نہ راس آئے مجھے — یہ مرا فنِ خاندانی ہے

والد بزرگوار نے ہر چند کوشش کی کہ بشیر احمد خاں کو شعر کہنے سے روکا جائے لیکن اپنی تمام کاوشوں کے باوجود، وہ کامیاب نہیں ہو سکے اور مجبور ہو کر شعر کہنے کی اجازت بھی دے دی اور اپنے ہمراہ لکھنؤ کے مشاعروں میں شریک بھی کرنے لگے۔

جوش ملیح آبادی فرماتے ہیں ــــ "یہ غالباً ۱۹۱۰ء یا ۱۹۱۱ء کی بات ہے کہ میں اپنے باپ کی معیت میں حضرت مولانا رضا فرنگی محلی کے مشاعرے میں سب سے پہلی بار شریک ہوا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔
رعب محفل سے میں کانپ رہا ہوں، شعراء کی صفوں سے آوازیں آ رہی ہیں۔ بسم اللہ صاحبزادے بسم اللہ، لیکن صاحبزادے کا دم نکلا ہوا ہے۔ کیا مجال کہ منھ سے ایک حرف بھی نکل سکے۔ اب میرے باپ مجھ سے فرما رہے ہیں۔ پڑھتے کیوں نہیں، پٹھان کا بیٹا بارہ برس کی عمر ہی سے رن میں تلوار چلانے لگتا ہے اور ایک تم ہو کہ تم سے غزل نہیں پڑھی جا رہی ہے، اب مرزا محمد ہادی رسوا صاحب اپنی جگہ سے اٹھ کر میرے پہلو میں آگئے ہیں اور پیٹھ ٹھونک کر فرما رہے ہیں ــــ "صاحبزادے، آپ تو شاعر، شاعر کے بیٹے، شاعر کے پوتے اور شاعر کے پرپوتے ہیں، پڑھیے اور گرج کر پڑھیے۔" اب بڑی ہمت کر کے میں مطلع پڑھ رہا ہوں، مطلع پر داد مِل رہی ہے اور داد کے نشے میں شعر پڑھ رہا ہوں ؎

اے نسیمِ صبح کے جھونکو، یہ تم نے کیا کیا
میرے مستِ خواب کی زلفیں پریشاں ہو گئیں

(یادوں کی برات صفحہ ۱۰۲/۱۰۱)

اس مشاعرے کے بعد بشیر احمد خاں نے، جوش کو حضرت عزیز لکھنوی کی شاگردی میں دے دیا، لیکن یہ سلسلہ چھ سات سال سے زیادہ دنوں تک برقرار نہیں رہ سکا کیونکہ جوش کی فکر کا جادہ اپنے استاد سے قطعی مختلف تھا۔ لہذا جوش نے جب اس بات کو اچھی طرح محسوس کر لیا کہ میرے استاد کی تخئیل میری تخئیل فکر کے ساتھ سفر نہیں کر رہی ہے، تو انھوں نے اصلاح لینا بند کر دیا۔

شعر و شاعری کے ساتھ ہی ساتھ جوش حصولِ علم کے لئے بھی مختلف میدانوں میں ہاتھ مارتے رہے۔ ۱۹۱۳ء میں، ایم۔ اے۔ او۔ کالج علی گڑھ میں، دسویں جماعت میں داخلہ لیا، لیکن اپنی شرارتوں کی وجہ سے وہاں سے نکال دیے گئے اور لکھنؤ واپس آکر جوبلی ہائی اسکول، چرچ مشن اسکول ریڈ کرسچین کالیجیٹ اسکول میں داخلے لیا لیکن کہیں بھی جم نہ سکے اور آخر کار، سینیئر کیمبرج کرنے کی غرض سے ۱۹۱۴ء میں سینٹ پیٹرز کالج آگرہ چلے گئے۔ اب باقاعدہ تعلیم کا سلسلہ شروع ہو گیا، لیکن ۱۹۱۶ء میں بشیر احمد خاں کے انتقال کی وجہ سے جوش کو مستقل طور سے ملیح آباد میں قیام کرنا پڑا، جس کے لئے انھوں نے اپنے چچا سے " امانی گنج " کے کشادہ میدان میں ریلوے لائن کے قریب ایک قطع آراضی، لیکر " قصرِ سحر " کی تعمیر شروع کر دی۔

۱۹۱۸ء میں جوش اپنے آبائی مکان کو چھوڑ کر " قصرِ سحر " میں منتقل ہو گئے اور " روحِ ادب " کی تخلیق کا کام شروع کر دیا۔

جوش ملیح آبادی کو وہ زمانہ ملا جب، مولانا حالی، علامہ شبلی اور اکبر الہ آبادی اردو شعر و ادب پر چھائے ہوئے تھے، شبلی کی سیاسی اور

ملی شاعری کی دھومیں مچی ہوئی تھیں اور اقبال اُن کے لہجے کے علاوہ اُن کے ملی رجحانات کو بھی اپنا چکے تھے۔ جبکہ جوش نے شبلی کے مذہب سے ناتا توڑ لیا تھا اور اُن کے رنگین اور سیاسی خیالات سے ہی متاثر تھے اور ملک کے قومی، سیاسی اور جنسی رجحانات پر ہی قلم اُٹھا رہے تھے۔ اُن کے ہم عصر، فانی بدایونی، حسرت موہانی، یگانہ چنگیزی، اصغر گونڈوی، جگر مرادآبادی اور فراق گورکھپوری غزل گو شعراء کی حیثیت سے مقبولیت حاصل کر رہے تھے۔ دوسرے ملک کے سیاسی حالات بھی ہر قدم پر کروٹیں بدل رہے تھے۔ جنگ یورپ میں ترکوں نے انگریزوں کے خلاف اعلانِ جنگ کر کے جرمنی کا ساتھ دیا۔ انگریزوں نے ترکوں سے جنگ شروع کی تو عام طور پر شمالی افریقہ کے ملکوں سے لے کر عرب ممالک تک تمام مسلم حکومتیں انگریزوں کے خلاف ہو گئیں۔ جنگ میں جرمنی کو شکست ہو گئی، لڑائی کا آخری بوجھ صرف ترکوں کو اُٹھانا پڑا۔ اُن کے عربی ممالک کو انگریزوں نے لے لیا، وہاں بغاوتیں کرا دیں، اسلامی خلافت کا شیرازہ منتشر ہو گیا۔

لیکن ہندوستان کے مسلمانوں نے ترکوں کی مدد کے لئے خلافت کی تحریک شروع کر دی، اس تحریک کو گاندھی جی کی حمایت حاصل ہو گئی اور اس طرح تحریکِ خلافت اور کانگریس کی قومی تحریک مل کر انگریزوں کے خلاف آزادی کی تحریک بن گئی، ہندو، مسلم اختلافات کا جو پودا انگریزوں نے لگایا تھا وہ سوکھ گیا مگر حادثہ پیش آیا کہ ترکوں کی قومی تحریک نے مصطفےٰ کمال پاشا کی قیادت میں ترکی کی خلافت اسلامیہ کو ختم کر کے خلیفہ کو معزول کر دیا اور ترکوں کی جمہوری حکومت بنا کر دنیا کے مسلمانوں کی قیادت سے دست بردار ہو گئی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ تحریکِ خلافت بے معنی ہو کر رہ گئی اور مسلمان جس جوش کے ساتھ سیاست

میں آ گئے تھے۔ اسی تیزی کے ساتھ سیاست سے ہٹ بھی گئے۔

اب ہندوستان کی آزادی کی لڑائی کا بوجھ انڈین نیشنل کانگریس نے اُٹھا لیا، جس کے اہم لیڈر گاندھی جی، پنڈت جواہر لال نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر راجندر پرشاد، خان عبدالغفار خاں، سبھاش چندر بوس، مرارجی ڈیسائی اور سردار پٹیل وغیرہ تھے۔ انگریز اپنی تائید کے لیے "ہندو مہاسبھا" اور "مسلم لیگ" کو بھی زندہ کیے ہوئے تھے۔ سکھوں کو بھی اہمیت دے رہے تھے یہ جتھے مکمل آزادی سے پہلے اپنے حقوق کا تحفظ چاہتے تھے اور اُن کے حقوق ایک دوسرے کے حقوق کو ختم کر دینے والے تھے۔ کانگریس کی ملک گیر تحریک سے مجبور ہو کر جب بھی انگریز صلح کی میز پر آتا تھا تو یہ حقوق حاصل کرنے والے جتھے بھی بات چیت میں شریک کیے جاتے۔ نتیجہ یہ نکلتا کہ آزادی کا مسئلہ اُلجھ کر رہ جاتا اور انگریز پوری دنیا میں ہندوستانیوں کے باہمی اختلافات کا پروپیگنڈہ کر کے کانگریس کی قومی تحریک کو بدنام کرنے لگتا۔

قومی آزادی کی تحریک کو کمزور کرنے کے لیے اہلِ یورپ نے بہت سے ملکوں میں "لڑاؤ اور حکومت کرو" کی پالیسی پر عمل کر کے، مذہبی، سیاسی، لسانی اور قومی تحریکیں شروع کی تھیں۔ ہندوستان کی جنگ آزادی کے زمانے میں جہاں ملک کے اندر مذہبی بنیادوں پر پارٹیاں بن رہی تھیں، وہاں ۱۹۱۷ء میں روس کے کمیونسٹ انقلاب نے بھی ملک کے پڑھے لکھے طبقے پر سیاسی اثر ڈالا۔ روسی انقلاب محنت پیشہ طبقے کی حکمرانی کا نام لے کر کامیاب ہوا تھا۔ یہ دنیا میں پہلی حکومت تھی جو طبقوں کے نام پر بنی تھی۔ اس اشتراکی تحریک نے صرف دو طبقوں کو تسلیم کیا تھا، ایک محنت پیشہ طبقہ اور دوسرا غیر محنت پیشہ، کمیونسٹ صرف محنت پیشہ طبقے کو تسلیم کرتے تھے جس میں بنیادی طور پر کسان اور مزدور تھے، وہ انھیں کے

ہاتھ میں نظامِ حکومت اور اقتدارِ اعلیٰ دینے کے قائل تھے۔ دوسرے طبقے کو فنا کر کے ملک میں صرف محنت پیشہ طبقے کو زندہ رکھنے کے دعویدار تھے ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی بھی انھیں بنیادوں پر قائم کی گئی، لیکن یہ پارٹی بڑی حد تک حصولِ آزادی کے لیے کانگریس سے تعاون کرتی رہی۔ چونکہ دونوں کے پروگراموں میں مطابقت نہیں تھی اس لیے زیادہ دن تک دونوں ساتھ ساتھ سفر نہ کر سکیں۔ کانگریس کے قومی نظریات اور اشتراکی تحریک کے غیر طبقاتی محنت پیشہ سماج میں زمین آسمان کا فرق موجود تھا۔

اشتراکی فلسفے کے مبلّغین ایک کمیونسٹ حکومت کے خواب دیکھ رہے تھے، جبکہ کانگریس کے سب سے اہم لیڈر گاندھی جی، اہنساوادی تھے اور اقتدار کی منتقلی کے لیے ستیہ گرہ اور پُرامن مزاحمت کی بات کرتے تھے۔ اُنھوں نے عدم تشدد کو اپنے فلسفے کی بنیاد بنا کر ایک ایسے سماج کی تعمیر کا کام شروع کیا جس میں محنت کی قدر کی جائے انسان سے محبت کا برتاؤ کیا جائے اور خدا کے لیے اپنی ذات کو وقف کر دیا جائے جبکہ اشتراکی فلسفے کے مبلغین جو مادی فلسفے کے علم بردار ہیں اور فطرت اور سماج کی تمام اشیاء کی صرف سائنسی توضیح قبول کرتے ہیں، مذہبی نہیں، وہ تسلیم کرتے ہیں کہ انسانی عقل تمام چیزوں سے افضل ہے اور ہر چیز کی ابتدا محض فطرت ہی میں موجود ہے۔ اشتراکیت کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ سماج کے تمام افراد میں مکمل اقتصادی اور تہذیبی مساوات ہو یعنی عام طور پر طبقوں اور سماجی گروہ کا فرق مٹ چکا ہو، جسمانی اور دماغی کام کرنے والوں کے درمیان کوئی فرق باقی نہ رہے۔

اشتراکی اور گاندھیائی فلسفے میں بہت سی باتیں مشترک ہیں اور ان میں ایک مخصوص فکری میلان پایا جاتا ہے۔ عدم تشدد، سامراج دشمنی، انسانیت دوستی

اور وطن پرستی کے جذبات کو دونوں ہی نے بنیاد تسلیم کیا ہے۔ گاندھی جی کا عدم تشدد اشتراکی فلسفے کی جان ہے جس کا اقرار لینن ان الفاظ میں کرتا ہے۔

___ " ہمارے آدرش میں عوام کے خلاف تشدد کی کوئی گنجائش نہیں......... سوشلزم قوموں کے خلاف تشدد کا مخالف ہے۔ یہ ناقابلِ نزاع ہے، لیکن سوشلزم عام طور پر انسانوں کے خلاف تشدد کا بھی مخالف ہے"۔

(گاندھی جی، ہندوستان کے عظیم سپوت، صفحہ ۲۴)

گاندھی جی روسی ادیب ٹالسٹائی سے اس قدر متاثر تھے کہ انھوں نے ۲۴ر ستمبر ۱۹۰۹ء کو ٹرانسوال (جنوبی افریقہ) سے ٹالسٹائی کو جو پہلا خط لکھا تھا۔ اُس میں جنوبی افریقہ میں کام کرنے والے ہندوستانیوں کی زبوں حالی کا تذکرہ تفصیل کے ساتھ کیا تھا۔ ٹالسٹائی نے ۲۶ر ستمبر کو اُس خط کے جواب میں گاندھی جی کو لکھا تھا۔

___ " ابھی آپ کا ایک انتہائی دلچسپ خط ملا، خدا آپ کے بھائیوں اور ٹرانسوال میں آپ کے ساتھیوں کی مدد کرے"۔

گاندھی جی اور ٹالسٹائی سے خط و کتابت کا یہ سلسلہ تھوڑے ہی دن چل سکا، اور اِن تھوڑے دنوں میں گاندھی جی نے ٹالسٹائی کے اثرات کو کافی حد تک قبول کیا، ایک روسی مصنف " رولان" اپنے مضمون " ایشیا: ٹالسٹائی کا ثانی" میں لکھتا ہے۔

___ " نوجوان ہندوستانی گاندھی نے رخصت ہوتے ہوئے ٹالسٹائی سے وہ مقدس نور حاصل کر لیا جو اس معمر روسی مصلح کے دل میں موجود تھا، اپنے خلوص و محبت اور اپنے غم کی آنچ

سے انھوں نے اس کی ضیا بڑھائی تھی گاندھی جی نے اس نور سے اپنی مشعل بنائی جس سے سارا ہندوستان جگمگا اُٹھا، اُس کی روشنی سارے کرۂ ارض میں پہنچنے لگی۔

(گاندھی جی ہندوستان کے عظیم سپوت صفحہ ۴۲)

بیسویں صدی کے آغاز ہی سے روس اور روسی لیڈروں نے جن ہندوستانیوں کو اپنی طرف متوجہ کیا اُن میں گاندھی جی بھی شامل تھے۔ روسی انقلاب کے اثرات پورے ہندوستان پر پڑنا کوئی تعجب کی بات نہیں تھی۔ روسی عوام کی فتح سے ہندوستان کے دبے اور کچلے ہوئے محنت پیشہ افراد کو یقیناً تقویت پہنچی اور ۱۹۲۰ء کے بعد ہندوستان کے تمام صنعتی مرکزوں اور شہروں میں کمیونسٹ پارٹی کی بنیاد پڑنے لگی اور کمیونسٹ پارٹی کی پہلی کل ہند کانفرنس دسمبر ۱۹۲۵ء میں کانپور میں منعقد ہوئی، ۱۹۲۷ء میں جواہر لال نہرو روس کے دورے پر گئے اور واپس آنے کے بعد اُنھوں نے اپنی متعدد تقریروں میں اشتراکی نظام کی تعریف کی۔

گاندھیائی اور اشتراکی فلسفے کے اثرات سے جوشؔ ملیح آبادی بھی متاثر ہوئے اُن کے دل میں بھی انسانیت کی خدمت اور جاگیردارانہ نظام کے خلاف جدوجہد کرنے کا جذبہ پیدا ہو گیا اور ۱۹۱۸ء میں اُنھوں نے "وطن" کے عنوان سے پہلی سیاسی نظم کہی اور وطنِ عزیز کو فرنگیوں سے آزاد کرانے کی دُھن لے کر گاندھی جی سے ملاقات کی غرض سے ۱۹۱۸ء ہی میں کانگریس کے اجلاس میں احمد آباد پہنچے اور گاندھی سے ملاقات کی، اور اُن کے پہلو میں پنڈت جواہر لال اور مولانا حسرتؔ موہانی کو بیٹھے دیکھا۔

مہاتما گاندھی، جواہر لال اور حسرتؔ موہانی جوشؔ کے سامنے تین یکجا کلچروں

کی شکل میں آئے یعنی گجرات کا وِلش کلچر، کشمیر کا پنڈت کلچر اور یو۔پی۔کا عرب کلچر ــــ اور ان تینوں کلچروں کے اثرات نے جوشؔ ملیح آبادی کو سیاسی بصیرت سے نواز کر اس قابل بنا دیا کہ وہ کہہ سکیں۔

کام ہے میرا تغیّر، نام ہے میرا شباب
میرا نعرہ انقلاب و انقلاب و انقلاب

لیکن ۱۹۲۵ء تک جوشؔ کی نظموں میں انگریز دشمنی کی کوئی جھلک۔ دکھائی نہیں دیتی۔ ۱۹۲۱ء میں "روحِ ادب" چھپ کر آئی، جس میں زیادہ تر منظر نگاری، فطرت شناسی، حُسن پرستی اور کسی حد تک تصوّف کی جھلک ہی نظر آتی ہے اور کہیں کہیں جنگ عظیم اور انسانیت کے دکھ درد کی باتیں بھی کی ہیں، لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ ۱۹۱۹ کا زمانہ ہندوستان کی جنگِ آزادی کا پُر آشوب زمانہ ہونے کے باوجود جوشؔ کی شخصیت پر اُس کے اثرات دکھائی نہیں دیتے جبکہ اُن کے دل میں انگریز دشمنی کے جذبات ۱۹۱۸ء ہی سے پیدا ہو چکے تھے، جس کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

ــــ "ایک روز میں لکھنؤ کے نخاس والے مکان کی بالائی منزل کے برآمدے میں اپنی کھلائی بڑی بی کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا کہ سڑک سے دفعتہً تڑاق تڑاق کی آوازیں آئیں۔ بڑی بی نے جھک کر دیکھا اور زار زار رونے لگیں۔ میں نے پوچھا یہ بیٹھے بٹھائے رونے کیوں لگیں بڑی بی۔ اُنھوں نے روتے ہوئے کہا "موا گاڑی والا چابک سے گھوڑے کو مار رہا ہے تڑاق، تڑاق ــــ ہائے، جانِ عالم پیا کے زمانے میں ان گھوڑوں کو رئیسوں کی آبرو سمجھا جاتا تھا، اِن کو دودھ، جلیبی اور ملائی کھلائی جاتی تھی،

جب سے ان بندر فرنگیوں کا راج ہوا ہے، اِن غازی مردوں کو چابکوں سے مارا جانے لگا ہے۔ بیٹا، یہ غازی مردکس شمار میں ہیں، اِن بندروں کا جب سے دَور دَورہ ہوا ہے بڑے بڑے شریف زادے گلیوں میں جوتیاں چٹخاتے پھرتے ہیں۔ اُنھوں نے یہ کہتے کہتے اپنے بے بوٹی کے کھُل سینے پر ہاتھ مار کر کہا —— " ہائے ہمارے جانِ عالم پیا اب کبھی نہیں ملیں گے۔" بڑی بی کی بات سُن کر میں بلبلا گیا اور فرنگی سے نفرت ہوگئی اور رہی سہی عالم لڑکپن کی نفرت آگے چل کر میری سیاسی نظموں کے روپ میں شعلہ افشانی کرنے لگی۔"

(یادوں کی برات، صفحہ ۷۷)

۱۹۱۸ء کی نظم "وطن" میں بھی جوشؔ نے صرف وطن کی عظمتوں کے گیت ہی گائے ہیں اور وطن کے پاؤں میں غلامی کی زنجیریں ڈالنے والوں سے کسی قسم کی نفرت کا اظہار نہیں کیا ہے ؎

اے وطن! پاک وطن! روحِ روانِ احرار   اے کہ ذرّوں میں ترے بوئے چمن رنگِ بہار
اے کہ خوابیدہ تری خاک میں شاہانہ وقار   اے کہ ہر خار ترا روکشِ صد روئے نگار

ریزے الماس کے تیرے خس و خاشاک میں ہیں
ہڈیاں اپنے بزرگوں کی تری خاک میں ہیں

پہلے جس چیز کو دیکھا وہ فضا تیری تھی   پہلے جو کان میں آئی وہ صدا تیری تھی
پالنا جس نے ہلایا وہ ہوا تیری تھی   جس نے گہوارے میں چوما وہ صبا تیری تھی

اوّلیں رقص ہوا مست گھٹا میں تیری
بھیگی ہیں اپنی مسیں آب و ہوا میں تیری

۱۹۲۴ء تک جوشؔ صرف اپنی محبوبہ سے چھیڑ چھاڑ کرتے رہے ہیں، اُسی کی خاطر حیدر آباد میں نظام کی ملازمت اختیار کرتے ہیں۔ لیکن یہیں سے جوشؔ کی شاعری کا نیا دور بھی شروع ہو جاتا ہے، مطالعہ وسعت اختیار کرتا ہے عشق کی آگ علم کی راکھ میں دبنے لگتی ہے، انگریز کے بڑھتے ہوئے مظالم کی داستانیں دردمند دل کو بےچین کرنے لگتی ہیں، تیس، بتّیس برس کی عمر ہو جاتی ہے لڑکپن اور نوعمری کے کچے دن، برسوں کی آگ میں تپ کر کندن بن جاتے ہیں اور جوشؔ گھنیری زلفوں کی چھاؤں سے نکل کر کُھلے آسمان کے نیچے، اپنے چاروں طرف نظریں دوڑا کر دیکھتے ہیں تو کہیں، ننگے بدن بچے راتوں میں اپنے گھٹنوں میں سر ڈالے ہوئے فٹ پاتھ پر ٹھٹھرتے دکھاتے دیتے ہیں، کہیں انسان بھوک کی شدّت سے تنگ آکر کتّے کے چاٹے ہوئے پتّے کو چاٹتا ہوا دکھائی دیتا ہے، کہیں نوجوان ہندوستانی دوشیزائیں نیم برہنہ جسموں کے ساتھ چلچلاتی دھوپ میں پتّھر کوٹتی دکھائی دیتی ہیں، کہیں انگریز کی گولیوں سے ہندوستانیوں کے سینے چھلنی ہو رہے ہیں، کہیں آزادی کے متوالوں کو کال کوٹھری میں بند کیا جا رہا ہے، کہیں انقلاب زندہ باد کا نعرہ لگانے والوں کو برف کی سِلوں پر لٹا کر کوڑے مارے جا رہے ہیں اور کہیں جیل کی سلاخوں کے پیچھے ادیب، شاعر، مصوّر اور ڈاکٹر "رام بانس" کوٹ رہے ہیں ـــــ گویا جوشؔ کو اچانک کوئی سوتے سے جھنجھوڑ دیتا ہے اور وہ اپنی تلوار سے زیادہ تیز نظموں کے ساتھ آزادی کی جنگ میں کود پڑتے ہیں۔

۱۹۲۵ء سے ۱۹۴۵ء تک پورے بیس برس جوشؔ نے آزادی کے سپاہی اور "ترقی پسند تحریک" کے سپاہی کی شکل میں مادرِ وطن کی خدمت کی ہے اور "ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں سے" جیسی خطرناک نظم لکھ کر آزادی کے متوالوں

میں نئی روح پھونکنے کی کوشش کی ہے۔ یہ نظم سب سے پہلے علی سردار جعفری نے "نیا ادب" میں شائع کی بعد میں جب "نیا ادب" کا وہ نمبر ضبط کر لیا گیا تو یہی نظم "آزادی کی نظمیں" نام کی کتاب میں شائع ہوئی، لیکن یہ کتاب بھی ضبط ہو گئی ـــــ اس نظم نے پورے ہندوستان میں تہلکہ برپا کر دیا اور اس کی ہزاروں کاپیاں ہاتھ سے لکھ لکھ کر ملک بھر میں پھیلا دی گئیں ـــ انھیں دنوں جوشؔ کے گھر کی تلاشی ہوئی، جس پر جوشؔ نے "تلاشی" کے عنوان سے بھی ایک نظم کہی، یہ دونوں نظمیں کسی مجموعے میں شامل نہیں ہیں میں نے ان کو بھی زیر نظر کتاب میں شامل کر دیا ہے۔

۱۹۴۷ء میں ملک آزاد ہو گیا لیکن جوشؔ کو ایسا محسوس ہوا گویا آزادی کا سفر ابھی مکمل نہیں ہوا ہے، کیونکہ آزادی کے بعد کے حالات سے وہ مطمئن نہیں ہو سکے اور انھوں نے "ترانۂ آزادیٔ وطن" اور "ماتمِ آزادی" جیسی نظمیں کہہ کر ہندوستان میں پیش آنے والے حالات کی شدید تنقید کی ہے ـــ

عصمت ملیح آبادی
ملیح آباد ـ لکھنؤ

فہرست

ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں سے

کس زباں سے کہہ رہے ہو آج تم سوداگرو
"دھر میں انسانیت کے نام کو اونچا کرو"
"جس کو سب کہتے ہیں ہٹلر بھیڑیا ہے، بھیڑیا"
"بھیڑیئے کو مار دو گولی پیئے امن و بقا"
"باغِ انسانی میں چلنے ہی پہ ہے بادِ خزاں"
"آدمیت لے رہی ہے ہچکیوں پر ہچکیاں"
"ہاتھ ہے ہٹلر کا رخشِ خودسری کی باگ پر"
"تیغ کا پانی چھڑک دو جرمنی کی آگ پر"

سخت حیراں ہوں کہ محفل میں تمہاری اور یہ ذکر
نوعِ انسانی کے مستقبل کی اب کرتے ہو فکر
جب یہاں آئے تھے تم سوداگری کے واسطے
نوعِ انسانی کے مستقبل سے کیا واقف نہ تھے؟
ہندیوں کے جسم میں کیا روحِ آزادی نہ تھی؟
سچ بتاؤ کیا وہ انسانوں کی آبادی نہ تھی؟
اپنے ظلمِ بے نہایت کا فسانہ یاد ہے؟
لوٹتے پھرتے تھے جب تم کارواں در کارواں
سر برہنہ پھر رہی تھی دولتِ ہندوستاں

دست کاروں کے انگوٹھے کاٹتے پھرتے تھے تم
سر دلاشوں سے گڑھوں کو پاٹتے پھرتے تھے تم
صنعتِ ہندوستاں پر موت تھی چھائی ہوئی
موت بھی کیسی، تمہارے ہاتھ کی لائی ہوئی
اللہ اللہ کس قدر انصاف کے طالب ہو آج
میر جعفر کی قسم، کیا دشمنِ حق تھا سراج؟
کیا اودھ کی بیگموں کا بھی ستانا یاد ہے؟
یاد ہے، جھانسی کی رانی کا زمانا یاد ہے؟
ہجرتِ سلطانِ دہلی کا سماں بھی یاد ہے؟
شیرِ دل ٹیپو کی خونی داستاں بھی یاد ہے؟
تیسرے فاقے میں اک گرتے ہوئے کو تھامتے
کس کے تم لائے تھے سر شاہِ ظفر کے سامنے؟
یاد تو ہوگی وہ مٹیا برج کی بھی داستاں
اب بھی جس کی خاک سے اٹھتا ہے رہ رہ کر دھواں
تم نے قیصر باغ کو دیکھا تو ہوگا بارہا؟
آج بھی آتی ہے جس سے ہائے اختر کی صدا
سچ کہو کیا حافظے میں ہے وہ ظلمِ بے پناہ
آج تک رنگون میں اک قبر ہے جس کی گواہ
ذہن میں ہوگا یہ تازہ ہندیوں کا داغ بھی؟
یاد تو ہوگا تمھیں جلیان والا باغ بھی؟
پوچھ لو اُس سے تمہارا نام کیوں تابندہ ہے؟
"ڈائر" گرگِ دہن آلود اب بھی زندہ ہے!

وہ بھگت سنگھ اب بھی جس کے غم میں دل ناشاد ہے
اُس کی گردن میں جو ڈالا تھا وہ پھندا یاد ہے؟
اہلِ آزادی رہا کرتے تھے کس ہنجار سے
پوچھ لو یہ قید خانوں کے در و دیوار سے
اب بھی ہے محفوظ جن میں طنطنہ سرکار کا
آج بھی گونجی ہوئی ہے جس کے کوڑوں کی صدا
آج کشتیِ امن کی امواج پر کھیتے ہو کیوں؟
سخت حیراں ہوں کہ اب تم درسِ حق دیتے ہو کیوں؟
اہلِ قوت دامِ حق میں تو کبھی آتے نہیں
"بینکی" اخلاق کو خطرے میں بھی لاتے نہیں
لیکن آج اخلاق کی تلقین فرماتے ہو تم
ہو نہ ہو اپنے میں اب قوت نہیں پاتے ہو تم
اہلِ حق روشن نظر ہیں، اہلِ باطل کور ہیں
یہ تو ہیں اقوال اُن قوموں کے جو کمزور ہیں
آج شاید منزلِ قوت میں تم رہتے نہیں
جس کی لاٹھی اس کی بھینس، اب کس لیے کہتے نہیں؟
کیا کہا "انصاف ہے انساں کا فرضِ اوّلیں
کیا فساد و ظلم کا اب تم میں کس باقی نہیں؟
دیر سے بیٹھے ہو نخلِ راستی کی چھاؤں میں
کیا خدا ناکردہ کچھ موچ آ گئی ہے پاؤں میں؟

گو بخ تاپوں کی نہ آبادی نہ ویرانے میں ہے
خیر تو ہے، اسپ تازی کیا شفاخانے میں ہے؟
آج کل تو ہر نظر میں رحم کا انداز ہے
کیا طبیعت کچھ نصیب دشمناں ناساز ہے؟
سانس کیا اُکھڑی کہ حق کے نام پر مرنے لگے
نوعِ انساں کی ہوا خواہی کا دم بھرنے لگے
ظلم بھولے، راگنی انصاف کی گانے لگے
لگ گئی ہے آگ کیا گھر میں کہ چلانے لگے؟
مجرموں کے واسطے زیبا نہیں یہ شور و شین
کل یزید و شمر تھے اور آج بنتے ہو حسین
خیر، اے سوداگرو، اب ہے تو بس اس بات میں
وقت کے فرمان کے آگے جھکا دو گردنیں
اک کہانی وقت لکھے گا نئے مضمون ـــ کی
جس کی سرخی کو ضرورت ہے تمہارے خون کی
وقت کا فرمان اپنا رخ بدل سکتا ـــ نہیں
موت ٹل سکتی ہے اب فرمان ٹل سکتا نہیں

(سنہ ۱۹۳۹ء)

لہ ۱۹۳۹ء میں جنگ عظیم شروع ہونے کے بعد جوش ملیح آبادی نے مشہور انقلابی نظم "ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں سے" کہی تھی، یہ نظم "نیا ادب اور کلیم" کے شمارے میں پہلی بار ۱۹۳۹ء شائع ہوئی تھی۔ بعد میں یہی نظم سبط حسن نے اپنی کتاب (باقی صفحہ ۲۸ پر)

(صفحہ ۲۷ کا بقیہ) .... میں شامل کی تھی، جسے انگریزی حکومت نے فوراً ضبط کر لیا تھا۔ "نیا ادب اور کلیم" کے شمارہ نومبر ۴۶ء میں ذیل کا اداریہ لکھا گیا تھا۔

"آزادی کی نظمیں" خلافِ قانون قرار دی جا چکی ہے اور جوش کی نظم "ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں سے" جو اِن دنوں بچے بچے کی زبان پر ہے اور بہار و بنگال میں لاکھوں کی تعداد میں چھپ کر تقسیم ہوئی ہے، ضبط کر لی گئی ہے۔

تلاشی[1]

جس سے امیدوں میں بجلی آگ ارمانوں میں ہے
اے حکومت! کیا وہ شئے ان میز کے خانوں میں ہے
بند پانی میں سفینہ کھے رہی ہے کس لئے
تو مرے گھر کی تلاشی لے رہی ہے کس لیے
گھر میں درویشوں کے کیا رکھا ہوا ہے بد نہاد
آ مرے دل کی تلاشی لے کہ بر آئے مُراد
جس کے اندر دہشتیں پر ہول طوفانوں کی ہیں
لرزہ افگن آندھیاں، تیرہ بیابانوں کی ہیں
جس کے اندر ناگ ہیں اے دشمنِ ہندوستاں!
شیر جس میں ہونکتے ہیں، کوندتی ہیں بجلیاں
چھوٹتی ہیں جس سے نبضیں افسر و اورنگ کی
جس میں ہے گونجی ہوئی آوازِ طبلِ جنگ کی
جس کے اندر آگ ہے دنیا پہ چھا جائے وہ آگ
نارِ دوزخ کو پسینہ جس سے آ جائے وہ آگ
موت جس میں دیکھتی ہے منہ اُس آئینے کو دیکھ
میرے گھر کو دیکھتی کیا ہے، میرے سینے کو دیکھ

---

[1] "نیا ادب اور کلیم" کے شمارہ ۶-۴۰ء میں نظم "تلاشی" کے سلسلے (باقی صفحہ ۳۰ پر)

(صفحہ ۲۹ کا بقیہ) میں اداریہ اس طرح تھا ـــــــــ ۲۴ر ستمبر کو لکھنؤ پولیس نے جوش ملیح آبادی کے مکان کی تلاشی لی۔ تلاشی "ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں سے" کے سلسلے میں ہوئی تھی ـــــ شمارہ میں صفحہ ۲۵ - ۲۶ پر جوش صاحب کی نظم "تلاشی شایع ہو رہی تھی جس کو پریس نے چھاپنے سے انکار کر دیا"

نظم " تلاشی " کبھی کسی رسالے میں شائع نہیں ہوئی، یہ نظم ۲۹ء میں ریڈیو برلن سے نشر ہوئی تھی، جسے بہت سے لوگوں نے یاد کر لیا تھا، اب یہ نظم جوش صاحب کے پاس بھی موجود نہیں ہے، ماہنامہ " افکار" کراچی کے ایڈیٹر صہبا لکھنوی صاحب نے اپنی کوششوں سے اس نظم کو ڈاکٹر عبادت بریلوی سے حاصل کیا اور ۱۹۶۲ء میں " افکار" کے "جوش نمبر" میں شایع کیا۔

تہدیہ [۱]

اے روحِ عصرِ حاضر و ہندوستانِ نو
لایا ہے اک صحیفۂ سخنداں ترے لیے

اس مصحفِ عظیم کی اللہ ری وسعتیں
ہر حد ہے مشرقین بداماں ترے لیے

ہر منظرِ حیات کو دیکھا ہے غور سے
چھوڑا نہیں ہے ایک بھی عنواں ترے لیے

رکتی ہے جس مقام پہ روح الامیں کی سانس
دل کو وہاں کیا ہے پُر افشاں ترے لیے

لایا ہوں بزم و رزم کی ارضِ تضاد سے
یہ طبلِ جنگ و سازِ شبستاں ترے لیے

کتنی شبوں کے طاق میں رکھ کر چراغِ دل
پرکھی ہے روحِ عالمِ امکاں ترے لیے

اس کی خبر بھی ہے کہ بنایا گیا ہے لحن
کتنی شبوں کا گریۂ پنہاں ترے لیے

ڈھالے ہیں مرغزار و گلستاں کی شکل میں
کتنے مہیب و تیرہ بیاباں ترے لیے

گوندھی گئی ہے تارِ سخن میں، خبر بھی ہے
کن مہوشوں کی زلفِ پریشاں ترے لیے

کس کو خبر، تراش کے کن ظلمتوں کا دل
لایا ہوں میں یہ چشمۂ حیواں ترے لیے

میں تجھ سے کیا کہوں کہ سخن میں کیا ہے حل
کس شوخ کا تبسمِ پنہاں ترے لیے

واقف بھی ہے کہ موجِ سخن میں ہوئی ہے صرف
کن انکھڑیوں کی جنبشِ مژگاں ترے لیے

لایا ہوں وزنِ شعر کی منزل میں کیا کہوں
کیونکر جراحتِ دلِ انساں ترے لیے

تعبیر کی ترازوئے نرم و نہفتہ میں
تولے ہیں کتنے خوابِ پریشاں ترے لیے

کیا پوچھتا ہے جوشؔ کی بربادیوں کا حال
پُرزے ہے کب سے جیبِ گریباں ترے لیے

---

[۱] شعلہ و شبنم

پیمانِ محکم

قسم اُن غازیوں کی موت سے جو جنگ کرتے ہیں
اُپی تلوار کی بُرش سے جن کے زخم بھرتے ہیں
قسم اُن کی جو ہنس کر خون میں اپنے نہاتے ہیں
خوشی سے رن میں ڈٹ کر منہ پہ تلواریں جو کھاتے ہیں
قسم اُن کی نظر تیر و سناں سے جن کی لڑتی ہے
اکڑ جاتے ہیں طبلِ جنگ پر جب چوب پڑتی ہے
قسم اُس نور کی بخشا گیا تھا جو رسالت کو
قسم اُس سوزِ پنہاں کی جو ملتا ہے محبت کو
قسم اُس برق کی جو گر کے خرمن پھونک دیتی ہے
قسم اُس موت کی جو خنجروں میں سانس لیتی ہے
قسم ہے اُس کماں کی جو سرِ میداں کڑکتی ہے
قسم اُس آگ کی جو قلبِ شاعر میں بھڑکتی ہے
قسم اُس زخم خوردہ شیر کی خونی ڈکاروں کی
گرج سے جس کی نبضیں چھوٹ جاتی ہیں کچھاروں کی
قسم اُس جذبۂ غیرت کی جو آزاد کرتا ہے
قسم اُس طنطنہ کی جس پہ ہر خوددار مرتا ہے
قسم اُس شعلۂ غم کی جو فرقت میں بھڑکتا ہے
قسم ہے اُس لہو کی چشمِ تر سے جو ٹپکتا ہے

قسم اُن گھن گرج پُر ہول توپوں کے دہانوں کی
گرج سے جن کی ہل جاتی ہیں بنیادیں چٹانوں کی
قسم اُس کھڑکھڑاہٹ کی زرہ سے جو نکلتی ہے
قسم اُن زمزموں کی، جن کی رو پر فوج چلتی ہے
قسم گھوڑوں کی اُن ٹاپوں کی جو رَن کو ہلاتی ہیں
سروں پر گرد کا اک خوں چکاں بادل بناتی ہیں
قسم اُس سانس کی جو موت کے ہنگام چلتی ہے
قسم اُس وقت کی جب زندگی کروٹ بدلتی ہے
قسم اُس عزم کی ساونت جب میداں میں جاتے ہیں
دمِ رخصت عروسِ نو کا جب گھونگھٹ اُٹھاتے ہیں
قسم اُس کی ثبوت اپنی شرافت کا جو لاتا ہے
نسب نامے پہ اپنے تن کی مہریں لگاتا ہے
قسم اے موت اُن کی رنگ تیرا جو اُڑاتے ہیں
تیری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جو مسکراتے ہیں
قسم اُن قوتوں کی جو ملی تھیں رام و لچھمن کو
قسم اُس آگ کی جو کھا گئی تھی ملکِ راون کو
قسم اُس نور کی روشن تھے جادے جس سے صحرا کے
جھمکتا تھا جو ٹیکے کی طرح ماتھے پہ سیتا کے
قسم اُس ضرب کی توڑا تھا جس نے بابِ خیبر کو
قسم اُس شیر کی جس نے چبا ڈالا تھا عنتر کو

قسم اُس پیاس کی کوثر کی رو پر جس کا قبضہ تھا
قسم اُس ابر کی جو کربلا میں گھر کے برسا تھا
قسم اُس تیر کی چلتا تھا جو چٹکی سے ارجن کی
قسم، میدان میں گاتی ہوئی تلوار کی دُھن کی
قسم اُس جوش کی جو ڈوبتی نبضیں اُبھارے گا
کہ اے ہندوستاں! جیسے ہی تو مجھکو پکارے گا
مری تیغِ رواں، باطل کے سر پر جگمگائے گی
ترے ہونٹوں کی جنبش ختم بھی ہونے نہ پائے گی

لہ شعلہ و شبنم - جوشؔ - ص ا -

غلاموں سے خطاب[1]

اے ہند کے ذلیل غلامانِ روسیاہ
شاعر سے تو ملاؤ خدا کے لیے نگاہ

اس خوفناک رات کی آخر سحر بھی ہے
توپیں گرج رہی ہیں سروں پر خبر بھی ہے

اے اُمتِ شکستہ دل و اے گروہِ شل
کب سے بلا رہا ہوں میں تجھکو سوئے عمل

تجھ پر مرے کلام کا ہوتا نہیں اثر
چونکا رہا ہوں کب سے میں شانے جھنجھوڑ کر

حالانکہ میرا شعر ہے وہ حرفِ تند و تیز
طوفان بدوش و صاعقہ پیمان و حشر خیز

ضد پر جو آئے بات میں پتھر کو توڑ دے
صرف ایک صدا سے گنبدِ بے در کو توڑ دے

چاہے تو زہرہ سے اُڑنے لگیں شرار
گلبرگ تر کے بطن سے پیدا ہو ذوالفقار

اُکسائے میرا شعر اگر جذبہ ہائے جنگ
پیدا ہو آبگینے کے اندر مزاجِ سنگ

خرمن میں میرا شعر اگر کج کرے کلاہ
خس تند بجلیوں سے لڑانے لگے نگاہ

آہن کے جوہروں سے ٹپکنے لگے شراب
پیری کی ہڈیوں میں مچلنے لگے شباب

تجکو یقین نہ آئے گا اے دائمی غلام!
میں جا کے مقبروں میں سناؤں اگر کلام

خود موت سے حیات کے چشمے اُبل پڑیں
قبروں سے سر کو پیٹ کے مُردے نکل پڑیں

میرے رجز سے لرزہ بر اندام ہے زمیں
افسوس تیرے کان پہ جوں رینگتی نہیں

تو چپ رہا، زمیں ہلی، آسماں ہلا
تجھ سے تو کیا، خدا سے کروں گا میں یہ گلا

اِن بزدلوں کے حُسن پہ شیدا کیا ہے کیوں؟
نامرد قوم میں مجھے پیدا کیا ہے کیوں؟

---

[1] شعلہ و شبنم ۔ ص ۲۔

ترکِ جمود

ہر اک کے واسطے یہ نازشِ دوام کہاں
نبردِ عشق کہاں، جرأتِ عوام کہاں
تڑپ کے مجھکو پکارا ہے ملک و ملت نے
اب آج سے مجھے پروائے ننگ و نام کہاں
ہوا ہے حکم کہ لے کام موجِ صرصر سے
اب اختلاطِ نسیمِ سبک خرام کہاں
کہا گیا ہے کہ پی مہر نیم روز سے مے
اب انتظامِ شبِ ماہ و دَورِ جام کہاں
عطا کیا ہے مشیّت نے نظمِ دشت و جبل
دماغِ عشق کو اب فکرِ سقف و بام کہاں
نظر ہے اوج پہ، جنبش میں ہیں پرِ پرواز
بساطِ خاک پر اب فرصتِ قیام کہاں
نظر ہے جلوہٗ عالم کی ناتمامی پر
اب اعتبارِ جمالِ مہِ تمام کہاں
سرِ نیاز ہے خم، پیشِ پختگانِ جنوں
اب احترامِ دلِ افسردگانِ خام کہاں
نگاہ میں ہے جوانانِ برق رو کی روش
اب اقتدائے حریفانِ لالہ فام کہاں

تغیرات کی رو سے گزر رہی ہے نگاہ
اب اہتمامِ تماشائے حسن و بام کہاں
لبِ حیات نے چھیڑا ہے قصۂ خونیں
مری زبان کو اب رخصتِ کلام کہاں

چلا ہوں سر بکف اس سمت آج خود ہی جوشؔ
اب آرزو کو سرِ نامہ و پیام کہاں

لہ شعلہ و شبنم - ص ۴ -

نعرۂ شباب

(بوڑھے لیڈروں کی انجمن میں)

ہوشیار! اپنی متاعِ رہبری سے ہوشیار
اے جنوں نا آشنا پیری و شیبِ ہرزہ کار
اُڑ گیا روئے نگارِ آسماں سے رنگِ خواب
جھلملاتی شمع! رخصت ہو، کہ اُبھرا آفتاب
ہٹ کہ اب سعی و عمل کی راہ میں آتا ہوں میں
خلق واقف ہے کہ جب آتا ہوں چھا جاتا ہوں میں
اے قدامت! یہ کھلی ہے سامنے راہِ فرار
بھاگ وہ آیا نئی تہذیب کا پروردگار!
کام ہے میرا تغیّر نام ہے میرا شباب
میرا نعرہ انقلاب و انقلاب و انقلاب
کوئی قوت راہ سے مجھ کو ہٹا سکتی نہیں
کوئی ضربت میری گردن کو جھکا سکتی نہیں
رنگ سورج کا اُڑاتا ہے مرے سینے کا داغ
بادِ صرصر کا بدل دیتا ہے رُخ میرا چراغ
سنگ و آہن تک میں میری نظروں سے چبھ جاتی ہے پھانس
آندھیوں کی میرے میداں میں اُکھڑ جاتی ہے سانس

دیکھ کر میرے جنوں کو ناز فرماتے ہوئے
موت شرماتی ہے میرے سامنے آتے ہوئے
الاماں، کبڑی، ریا آلودہ پیری! الاماں
اب کڑکتی ہے ترے سر پر جوانی کی کماں
ہو جو غیرت ڈوب مر، یہ عمر، یہ درسِ جنوں
دشمنوں کی خواہشِ تقسیم کی صیدِ زبوں
یہ ستم کیا اے کنیز "کفر و ایماں" کر دیا؟
بھائیوں کو گائے اور باجے پہ قرباں کر دیا
کر دیا طولِ غلامی نے تجھے کوتہ خیال
جُھرّیاں ہیں یہ تیرے منھ پر کہ غدّاری کا جال
دیکھتی ہے صرف اپنے ہی کو اے دھندلی نگاہ
سر بھڑک اُٹھا ہے لیکن دل ابھی تک ہے سیاہ
پوپلے منھ، ختم کر یہ "عاقبت بینی" کا شور
دیکھ اب بزدل مری "ناعاقبت بینی" کا زور
چہرۂ "امروز" ہے میرے لیے ماہِ تمام
خوفِ "فردا" ہے مری زنگیر شریعت میں حرام
تیر جاتی ہے دلِ فولاد میں میری نظر
خون میرا خندہ زن رہتا ہے موجِ برق پر
اور تمنائیں ہیں تیری سسکیاں بھرتی ہوئی
اونگھتی، کڑھتی، بلکتی، کانپتی، ڈرتی ہوئی

تیری باتوں سے پڑی جاتی ہے کانوں میں خراش
"کفر و ایماں" "کفر و ایماں" تاکجا، خاموش باش
حبِ انساں، ذوقِ حق، خوفِ خدا کچھ بھی نہیں
تیرا "ایماں" چند وہموں کے سوا کچھ بھی نہیں
تیرے جھوٹے "کفر و ایماں" کو مٹا ڈالوں گا میں
ہڈیاں اس "کفر و ایماں" کی چبا ڈالوں گا میں
ولولے میرے بڑھیں گے ناز فرماتے ہوئے
فرقہ بندی کا سرِ ناپاک ٹھکراتے ہوئے
ڈال دوں گا طرحِ نو اجمیر اور پریاگ میں
جھونک دوں گا "کفر و ایماں" کو دہکتی آگ میں
کوثر و گنگا کو اک مرکز پہ لانے کے لیے
اک نیا سنگم بناؤں گا زمانے کے لیے
ایک دینِ نو کی لکھوں گا کتابِ زرفشاں
ثبت ہو گا جس کی زرّیں جلد پر "ہندوستاں"
اس نئے مذہب پہ سارے تفرقے واروں گا میں
تجھ پہ پھر گردن ہلا کر قہقہے ماروں گا میں
پھر اٹھوں گا ابر کے مانند بل کھاتا ہوا
گھومتا، گھرتا، گرجتا، گونجتا، گاتا ہوا

خون میں لتھڑی بساطِ "کفر و دیں" اُلٹے ہوئے
نخر سے سینے کو تانے آستیں اُلٹے ہوئے

ولولوں سے برق کی مانند لہرایا ہوا
موت کے سائے میں رہ کر، موت پر چھایا ہوا

لہ شعلہ و شبنم۔ ص ۵۔

حسن اور مزدوری[1]

ایک دوشیزہ، سڑک پر دھوپ میں ہے بیقرار
چوڑیاں بجتی ہیں کنکر کوٹنے میں بار بار
چوڑیوں کے ساز میں یہ سوز ہے کیسا بھرا
آنکھ میں "آنسو" بنی جاتی ہے جس کی ہر صدا
گرد ہے رخسار پر، زلفیں اٹی ہیں خاک میں
نازکی بل کھا رہی ہے دیدۂ غمناک میں
ہو رہا ہے جذب، مہر خونچکاں کے روبرو
کنکروں کی نبض میں اٹھتی جوانی کا لہو
دھوپ میں لہرا رہی ہے کاکلِ عنبر سرشت
ہو رہا ہے کمسنی کا لوچ جزو سنگ و خشت
پی رہی ہے سرخ کرنیں مہر آتش بار کی
نرگسی آنکھوں کا رس، مے چمپئی رخسار کی
غم کے بادل، خاطرِ نازک پہ ہیں چھائے ہوئے
عارض رنگیں ہیں یا دو پھول مرجھائے ہوئے
چیتھڑوں میں دیدنی ہے روئے غمگینِ شباب
ابر کے آوارہ ٹکڑوں میں ہو جیسے ماہتاب
اُف یہ ناداری! مرے سینے سے اٹھتا ہے دھواں
آہ! اے افلاس کے مارے ہوئے ہندوستاں!

حسن ہو مجبور کنکر توڑنے کے واسطے
دستِ نازک اور پتھر توڑنے کے واسطے
فکر سے جھک جائے وہ گردن تف اے لیل و نہار
جس پہ ہونا چاہیے پھولوں کا اک ہلکا سا ہار
آسماں، جانِ طرب کو وقفِ رنجوری کرے
صنفِ نازک بھوک سے تنگ آ کے مزدوری کرے
اُس جبیں پر اور پسینہ ہو جھلکنے کے لیے
جو جبینِ ناز ہو افشاں چھڑکنے کے لئے
بھیک میں وہ ہاتھ اُٹھیں التجا کے واسطے
جن کو قدرت نے بنایا ہو حنا کے واسطے
نازکی سے جو اُٹھا سکتی نہ ہو کاجل کا بار
اُن سبک پلکوں پہ بیٹھے راہ کا بوجھل غبار
کیوں فلک، مجبور ہوں آنسو بہانے کے لئے
انکھڑیاں ہوں جو دلوں میں ڈوب جانے کے لئے
مفلسی، چھانٹے اُسے قہر و غضب کے واسطے
جس کا مکھڑا ہو شبستانِ طرب کے واسطے
فرطِ خشکی سے وہ لب ترسیں تکلم کے لیے
جن کو قدرت نے تراشا ہو تبسم کے لیے

نازنینوں کا یہ عالم، مادرِ ہند آہ! آہ!
کس کے جورِ ناروا نے کر دیا تجکو تباہ؟

حُسن برستا تھا کبھی دن رات تیری خاک پر
سچ بتا اے ہند! تجکو کھا گئی کس کی نظر؟
باغ تیرا کیوں جہنم کا نمونہ ہو گیا؟
آہ کیوں تیرا بھرا دربار سونا ہو گیا؟
سر برہنہ کیوں ہے؟ وہ پھولوں کی چادر کیا ہوئی؟
اے شبِ تاریک! تیری بزمِ اختر کیا ہوئی؟
جس کے آگے تھا قمر کا رنگ پھیکا کیا ہوا؟
اے عروسِ ہند! تیرے ماتھے کا ٹیکا کیا ہوا؟
اے خدا! ہندوستاں پر یہ نحوست تا کجا؟
آخر اس جنّت پہ دوزخ کی حکومت تا کجا؟
گردنِ حق پر خراشِ تیغِ باطل تا بکے؟
اہلِ دل کے واسطے طوق و سلاسل تا بکے؟
سرزمینِ رنگ و بو پر عکسِ گلخن تا کجا؟
پاک سیتا کے لیے زندانِ راون تا کجا؟
دستِ نازک کو رسن سے اب چھڑانا چاہیے
اس کلائی میں تو کنگن جگمگانا چاہیے

۱؎ شعلہ و شبنم ۔ ص ۸ ۔

آثارِ انقلاب

قسم اُس دل کی، چسکا ہے جسے صہبا پرستی کا
یہ دل، پہچانتا ہے جو مزاج اشیائے ہستی کا
قسم اُن تیز کانوں کی کہ ہنگام قدح نوشی
سُنا کرتے ہیں جو راتوں کو بحر و بر کی سرگوشی
قسم اُس روح کی، خو ہے جسے فطرت پرستی کی
گنا کرتی ہے راتوں کو جو ضربیں قلبِ ہستی کی
قسم اُس ذوق کی حاوی ہے جو آثارِ قدرت پہ
ضمیرِ کائنات آئینہ ہے جس کی لطافت پر
قسم اُس حس کی جو پہچان کر تیور ہواؤں کے
سُناتی ہے خبر طوفان کی طوفان سے پہلے
قسم اُس نور کی کشتی جو ان آنکھوں کی کھیتا ہے
جو نقشِ پا کے اندر عزم رہرو دیکھ لیتا ہے
قسم اُس فکر کی، سوگند اس تخئیل محکم کی
جو سنتی ہے صدائیں جنبشِ مژگان عالم کی
قسم اُس آنکھ کی جو درسِ بینش مجکو دیتی ہے
زمیں کی بھاپ میں جو بجلیوں کو دیکھ لیتی ہے
قسم اُس روح کی جو عرش کو رفعت سکھاتی ہے
کہ راتوں کو مرے کانوں میں یہ آواز آتی ہے

"اُٹھو، وہ صبح کا غرفہ کھُلا زنجیرِ شب ٹوٹی
وہ دیکھو پو پھٹی، غنچے کھِلے، پہلی کرن پھوٹی!"

"اُٹھو، چونکو، بڑھو، منھ ہاتھ دھو، آنکھوں کو مل ڈالو
ہوائے انقلاب آنے کو ہے ہندوستان والو!"

---

۱ شعلہ و شبنم - ص ۱۰ -

ملکوں کا رجزؔ

انگلستان

مری رزمِ عمل پر تنگ ہے عالم کی پہنائی　　مرے پائے تجارت پر جلالِ تاجِ دارائی
مری مٹھی میں ہے خورشید خاور بحرِ بے پایاں　　مری جودت کے آگے سرنگوں قوموں کی دانائی
معاذ اللہ میرے بحرِ ہمت کی گیرائی!

امریکہ

مری دولت کے آگے دولتِ قاروں ہے شرمندہ　　مرے آئین محکم ہیں، مری تعمیر پائندہ
مرے آئینۂ ثروت میں عکسِ زندگی غلطاں　　مری پیشانیٔ ہمت پہ برقِ عزم رخشندہ
مری جانکاہیاں بیدار، میری قوتیں زندہ!

فرانس

جواہر جنگِ عالمگیر کے میرے خزانوں میں　　بہشتِ رنگ و بو میرے مہکتے گلستانوں میں
دلوں میں عشق کی گرمی، سروں میں عقل کا سودا　　کبھی گم لحنِ خوباں میں، کبھی جنگی ترانوں میں
مری راتیں نگاروں میں، مرے دن کارخانوں میں!

جرمنی

خرابی سے ہمیشہ درسِ استحکام لیتا ہوں — حریفوں کے نزاعِ باہمی سے کام لیتا ہوں
عروسِ ارتقا کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتا — جو چھُٹ جاتا ہے تو پھر بڑھ کے دامن تھام لیتا ہوں
خدا چاہے تو پھر اب تیغِ خوں آشام لیتا ہوں!

روس

رواں ہو تیغ میری گردنِ غفلت شعاری پہ — مرا دل خون ہے مزدور کی فریاد و زاری پہ
جھکے ہیں کشتِ دہقاں پر مرے اُٹھے ہوئے بادل — تپاں ہے برق میری خرمنِ سرمایہ داری پہ
عرق سا ہے میری ہیبت سے جبینِ شہریاری پہ

جاپان

رہِ علم و عمل میں دیر سے ہنگامہ آرا ہوں — طلسمِ کاروبارِ شوق و طوفانِ تمنا ہوں
قسم کھائی ہے میری سعی نے بیدار بختی کی — میں ہر بازار کا یوسف ہوں ہر صنعت کا مولا ہوں
غرورِ ایشیا ہوں محرمِ امروز و فردا ہوں

ترکی

مرے افکار میں تہذیبِ نو کی کارفرمائی — پڑی ہے اک نئی صورت سے طرحِ بزم آرائی

"مریضِ جاں بلب" سمجھے ہوئے تھی جس کو اک دنیا
پڑی ہے اک نئی صورت سے طرحِ بزم آرائی
توانائی کے پردے میں ہے اعجازِ مسیحائی!

ایران

تبسم آفریں ہے پھر طلوعِ صبحِ نورانی کیانی شان و شوکت پھر ہے گرمِ بال جنبانی
گھٹا چھائی ہے رُکنا بادو بستانِ معلی پر برسنے پر ہے جذبِ کاوش و عزمِ جہاں بانی
"مبادا ایں جمع را یارب غم از بادِ پریشانی!

افغانستان

مرے دشت و جبل پر مہر آزادی کی تنویریں پڑی ہیں دیر سے ٹوٹی ہوئی غفلت کی زنجیریں
مرے ساونت میدانوں میں نکلے ہیں علم کھولے جبینوں پر اُبھر آئی ہیں خودداری کی تحریریں
نگاہوں میں چمکتی بجلیاں ہاتھوں میں شمشیریں!

ہندوستان

نہنگوں کا سمندر ہوں، درندوں کا بیاباں ہوں عدو سے کیا غرض اپنوں ہی سے دست و گریباں ہوں
خدا کے فضل سے بدبخت ہوں، بزدل ہوں ناداں ہوں مری گردن میں ہے طوقِ غلامی پا بجولاں ہوں
درِ آقا پہ سر ہے کفش برداری پہ نازاں ہوں!

۱؎ شعلہ و شبنم - ص ۱۱ -

بیدار رہو بیدار

اے مردِ خدا! فتنۂ اغیار سے ہشیار ہشیار ہو، ہشیار ہو، ہشیار ہو، ہشیار
ہم تجھ سے نہ کہتے تھے کہ ہونے کو ہے پیکار؟ لے آگئی، وہ سر پہ چمکتی ہوئی تلوار

بیدار رہو، بیدار رہو، بیدار رہو، بیدار

بیدار رہو، بیدار!!

بیدار ہے پھر فتنۂ چنگیز جہاں میں اور تو ہے ابھی تک اثرِ خوابِ گراں میں
صیاد کمینوں میں ہیں ناوک ہیں کماں میں پیشانیٔ دوراں پہ ہیں شبِ خون کے آثار

بیدار رہو، بیدار رہو، بیدار رہو، بیدار

بیدار رہو، بیدار!!

تو نے روشِ خدمتِ اغیار نہ چھوڑی اب تک رسنِ سبحہ و زنار نہ چھوڑی
آشفتگیٔ اندک و بسیار نہ چھوڑی افسوس ہے اے جنسِ غلامی کے خریدار

بیدار رہو، بیدار رہو، بیدار رہو، بیدار

بیدار رہو بیدار!!

شیون کبھی بلبل کو گوارا نہیں ہوتا جب تک گلِ رنگیں کا اشارا نہیں ہوتا
بے آگ جو چڑھتا ہے وہ پارا نہیں ہوتا بے وجہ نہیں کشمکشِ کافر و دیندار

بیدار رہو، بیدار رہو، بیدار رہو، بیدار

بیدار رہو، بیدار!!

مرہم ابھی تیار نہیں، زخم رسیدہ
افسوس ہے اے صاحبِ اوصاف حمیدہ
"گرگِ دہن آلودہ و یوسف نہ دریدہ"
اے مصر کے بازار میں یوسف کے خریدار

بیدار رہو، بیدار رہو، بیدار رہو، بیدار
بیدار رہو، بیدار!!

اب تک تری محرومیٔ تقدیر وہی ہے
بدلے ہوئے الفاظ ہیں تقریر وہی ہے
گو روپ تو زلفوں کا ہے زنجیر وہی ہے
ہر حلقۂ کاکل میں ہے زنجیر کی جھنکار

بیدار رہو، بیدار رہو، بیدار رہو، بیدار
بیدار رہو، بیدار!!

یک رنگ ہے جو جیت ہے دنیا میں اسی کی
اے صیدِ کشاکش! یہ دو رنگی نہیں اچھی
یا اپنے کفِ پا میں لگا ناز سے مہندی
یا جامۂ ہستی کو بنا خون سے گلنار

بیدار رہو، بیدار رہو، بیدار رہو، بیدار
بیدار رہو، بیدار!!

دم بھر تو کبھی غور کر اے خفتۂ مقدر
مادہ تجھے قدرت نے بنایا ہے کہ ہے نر
یا اوڑھ لے اے زہرہ جبیں مقنع و چادر
یا کھینچ لے اے مردِ خدا میان سے تلوار

بیدار رہو، بیدار رہو، بیدار رہو، بیدار
بیدار رہو، بیدار!!

یا جلوۂ رنگیں میں دکھا عشوۂ پُرفن
یا رن میں کچھ اس شان سے گونج اٹھے رن
یا گوندھ کے چوٹی کو پہن پھول سے کنگن
یا سر سے کفن باندھ کے مرنے پہ ہو تیار

بیدار رہو، بیدار رہو، بیدار رہو، بیدار
بیدار رہو، بیدار!!

یا فرشِ عروسی پہ بدل ناز سے پہلو ‏ ‏ یا عرصۂ جرات میں دکھا قوتِ بازو
یا رقص کی محفل میں بجا تال سے گھنگھرو ‏ ‏ یا جنگ کے میداں میں سنا تیغ کی جھنکار

بیدار رہو، بیدار رہو، بیدار رہو، بیدار
بیدار رہو، بیدار!!

لہ شعلہ و شبنم - ص ۱۵۱ -

صدائے بیداری[1]

یہ مانا سرزمینِ ہند پر نکہت برستی ہے
زبانوں پر حدیثِ اوج ہے فکروں میں پستی ہے

یہ مانا آج ہم میدانِ وحشت میں رجز خواں ہیں
عدو بھی سر بہ ہم آپس میں بھی دست و گریباں ہیں

مگر راتوں میں جب فکرِ وطن میں سر اٹھاتا ہوں
فضائے سرد میں دھیمی سی اک آواز پاتا ہوں

یہ آواز اس لطافت سے مرے کانوں میں آتی ہے
صبا جس طرح زیرِ شاخِ سنبل گنگناتی ہے

فضا میں جس طرح روح الامیں کی بال جنبانی
برستا ہو کہیں کچھ دور جیسے خواب میں پانی

جگاتی ہے سحر جس ناز سے نغموں کو دریا میں
ہوا کی سنسناہٹ جس طرح گنجان صحرا میں

حقیقت کیا بتاؤں اس صدائے روح افزا کی
نہاں ہیں جس کے اندر کاوشیں امروز و فردا کی

یہ مشرق محو ہے صبحِ تجلی زار ہونے میں
یہ روحِ ایشیا مصروف ہے بیدار ہونے میں

---

[1] شعلہ و شبنم ۔ ص ۱۵ ۔

کسان

جھٹپٹے کا نرم رو دریا، شفق کا اضطراب
کھیتیاں، میدان، خاموشی، غروبِ آفتاب
دشت کے کام و دہن کو دن کی تلخی سے فراغ
دور دریا کے کنارے دھندلے دھندلے سے چراغ
زیرِ لب' ارض و سما میں، باہمی گفت و شنود
مشعلِ گردوں کے بجھ جانے سے اک ہلکا سا دود
وسعتیں میدان کی سورج کے چھپ جانے سے تنگ
سبزۂ افسردہ پر، خواب آفریں ہلکا سا رنگ
خامشی اور خامشی میں سنسناہٹ کی صدا
شام کی خنکی سے گویا، دن کی گرمی کا گلا
اپنے دامن کو برابر قطع سا کرتا ہوا
تیرگی میں کھیتیوں کے درمیاں کا فاصلا
خار و خس پر ایک دردانگیز افسانے کی شان
بامِ گردوں پر کسی کے روٹھ کر جانے کی شان
دوب کی خوشبو میں شبنم کی نمی سے اک سرور
چرخ پر بادل، زمیں پر تتلیاں، سر پر طیور
پارہ پارہ ابر سرخی، سرخیوں میں کچھ دھواں
بھولی بھٹکی سی زمیں، کھویا ہوا سا آسماں

پتیاں مخمور، کلیاں آنکھ جھپکاتی ہوئی
نرم جاں پودوں کو گویا نیند سی آتی ہوئی
یہ سماں، اور اک قوی انسان یعنی کاشتکار
ارتقا کا پیشوا تہذیب کا پروردگار
جس کے ماتھے کے پسینے سے پئے عز و وقار
کرتی ہے دریوزہ تابش کلاہِ تاجدار
سرنگوں رہتی ہیں جس سے قوتیں تخریب کی
جس کے بوتے پر لچکتی ہے کمر تہذیب کی
جس کی محنت سے پھبکتا ہے تن آسانی کا باغ
جس کی ظلمت کی ہتھیلی پر تمدن کا چراغ
جس کے بازو کی صلابت پر نزاکت کا مدار
جس کے کس بل پر اکڑتا ہے غرورِ شہریار
دھوپ کے جھلسے ہوئے رخ، پر مشقت کے نشاں
کھیت سے پھیرے ہوئے منھ گھر کی جانب ہی رواں
ٹوکرا سر پر، بغل میں پھاوڑا، تیوری پہ بل
سامنے بیلوں کی جوڑی پشت پر مضبوط ہل
کون ہل؟ ظلمت شکن، قندیل بزمِ آب و گل
قصرِ گلشن کا دریچہ، سینۂ گیتی کا دِل
خوشنما شہروں کا بانی، رازِ فطرت کا سراغ
خاندانِ تیغِ جوہر دار کا چشم و چراغ

دھار پر جس کی چمن پرور شگوفوں کا نظام
شامِ زیر ارض کو، صبحِ درخشاں کا پیام
ڈوبتا ہے خاک میں جو روح دوڑاتا ہوا
مضمحل ذرّوں کی موسیقی کو چونکاتا ہوا
جس کے چھو جاتے ہی مثلِ نازنینِ مہ جبیں
کروٹوں پر کروٹیں لیتی ہے لیلائے زمیں
پردہ ہائے خواب ہو جاتے ہیں جس سے چاک چاک
مسکرا کر اپنی چادر کو ہٹا دیتی ہے خاک
جس کی تابش میں درخشانی ہلالِ عید کی
خاک کے مایوس مطلع پر کرن اُمّید کی
طفلِ باراں، تاجدارِ خاک، امیرِ بوستاں
ماہرِ آئینِ قدرت، ناظمِ بزمِ جہاں
ناظرِ گل، پاسبانِ رنگ و بو، گلشن پناہ
ناز پرور لہلہاتی کھیتیوں کا بادشاہ
وارثِ اسرارِ فطرت، فاتحِ امید و بیم
محرمِ آثارِ باراں، واقفِ طبعِ نسیم
صبح کا فرزند، خورشیدِ زر افشاں کا علم
محنتِ پیہم کا "پیماں" سخت کوشی کی "قسم"
جلوۂ قدرت کا شاہد، حسنِ فطرت کا گواہ
ماہ کا دل، مہرِ عالم تاب کا نورِ نگاہ

قلب پر جس کے نمایاں، نور و ظلمت کا نظام
منکشف جس کی فراست پر مزاجِ صبح و شام
خون ہے جس کی جوانی کا بہارِ روزگار
جس کے اشکوں پر فراغت کے تبسم کا مدار
جس کی محنت کا عرق تیار کرتا ہے شراب
اُڑ کے جس کا رنگ بن جاتا ہے جاں پرور گلاب
قلبِ آہن جس کے نقشِ پا سے ہوتا ہے رقیق
شعلہ خو جھونکوں کا ہمدم، تیز کرنوں کا رفیق
خون جس کا بجلیوں کی انجمن میں باریاب
جس کے سر پر جگمگاتی ہے کلاہِ آفتاب
لہر کھاتا ہے رگِ خاشاک میں جس کا لہو
جس کے دل کی آنچ بن جاتی ہے سیلِ رنگ و بو
دوڑتی ہے رات کو جس کی نظر افلاک پر
دن کو جس کی اُنگلیاں رہتی ہیں نبضِ خاک پر
سازِ دولت کو عطا کرتی ہے نغمے جس کی آہ!
مانگتا ہے بھیک تابانی کی، جس سے روئے شاہ
خون جس کا دوڑتا ہے نبضِ استقلال میں
لوچ بھر دیتا ہے جو شہزادیوں کی چال میں
جس کا مَس! خاشاک میں بنتا ہے ایک چادر مہین
جس کا لوہا مان کر، سونا اُگلتی ہے زمین

ہل پہ دہقاں کے چمکتی ہیں شفق کی سُرخیاں
اور دہقاں سر جھکائے گھر کی جانب ہے رواں
اُس سیاسی رتھ کے پہیوں پر جمائے ہے نظر
جس میں آجاتی ہے تیزی کھیتیوں کو روند کر
اپنی دولت کو جگر پر تیرِ غم کھاتے ہوئے
دیکھتا ہے ملکِ دشمن کی طرف جاتے ہوئے
قطع ہوتی ہی نہیں تاریکیٔ حرماں سے راہ
فاقہ کش بچوں کے دھندلے آنسوؤں پر ہے نگاہ
پھر رہا ہے خونچکاں آنکھوں کے نیچے بار بار
گھر کی نا اُمید دیوی کا شبابِ سوگوار
سوچتا جاتا ہے کِن آنکھوں سے دیکھا جائے گا
بے رِدا بیوی کا سر، بچوں کا منھ اُترا ہوا
سیم و زر، نان و نمک، آب و غذا، کچھ بھی نہیں
گھر میں اک خاموش ماتم کے سوا کچھ بھی نہیں
ایک دل اور یہ ہجومِ سوگواری، ہائے، ہائے
یہ ستم، اے سنگدل، سرمایہ داری ہائے ہائے
تیری آنکھوں میں ہیں غلطاں وہ شقاوت کے شرار
جس کے آگے خنجرِ چنگیز کی مُڑتی ہے دھار
بیکسوں کے خون میں ڈوبے ہوئے ہیں تیرے ہات
کیا چبا ڈالے گی او کمبخت! ساری کائنات؟

ظلم، اور اتنا، کوئی حد بھی ہے اس طوفان کی
بوٹیاں ہیں تیرے جبڑوں میں غریب انسان کی
دیکھ کر تیرے ستم، اے حامیِ امن و اماں!
گُنگ رہ جاتے ہیں دانتوں میں دبا کر انگلیاں
اِدّعائے 'پیروی'، دین و ایماں اور تو!!
دیکھ اپنی کہنیاں، جن سے ٹپکتا ہے لہو

ہاں سنبھل جا اب کہ زہرے اہلِ دل کے اب ہیں
کتنے طوفاں تیری کشتی کے لیے بیتاب ہیں

لہ شعلہ و شبنم۔ ص ۱۹۔

زوالِ جہانبانی

مبارک ہیں، مبارک، دشمنوں کے جورِ پنہانی
کہ مشکل کروٹیں لے لے کے بن جاتی ہے آسانی
تجھے معلوم ہے؟ تاریکیاں بڑھتی ہیں جب حد سے
اُبلنے لگتی ہے ذرّاتِ خاکی سے درخشانی
دیارِ مصر میں برسوں مسلسل قحط پڑتے ہیں
کہیں ہوتی ہے جب شادابِ کشتِ پیرِ کنعانی
منقّش ہو نہ جب تک دیدۂ خونبار سے چہرہ
نہیں کھلتی عروسِ رنگ و بو کی جبینِ پیشانی
سمجھتا بھی ہے کیوں غنچوں کے سینے چاک رہتے ہیں؟
شگوفوں کو ہے اس پردے میں درسِ عطر افشانی
نہانی ہیں لہو میں جب بہاریں حبِ قومی کی
تو ہوتا ہے شگفتہ لالہ زارِ حبِّ انسانی
ہزاروں آسماں جب سر پہ ظالم توڑ چکتا ہے
اُٹھاتا ہے کہیں جھنجھلا کے تب مظلوم پیشانی
اسیروں کی تڑپ بجلی گرا دیتی ہے زنداں پر
قفس کے حق میں اک شعلہ ہے طائر کی پر افشانی
مچلتا ہے گدا کے دل میں آزادی کا جب شعلہ
لرز اُٹھتا ہے پھنک جانے کے ڈر سے تاجِ سلطانی

گزر جاتی ہے جب افتادگی ہیں جوئے خوں کرکے
کہیں جب تخم کھلتا ہے فرمانِ گل افشانی
نہ گھبرا قید و پابندی سے، پابندی وہ دولت ہے
کہ بن جاتا ہے دُرِّ بے بہا، اک بوند بھر پانی
کلید فتح بن جاتا ہے اک دن قفل زنداں کا
سنا تو ہوگا تو نے بھی فسانہ ماہِ کنعاں کا

تلاطم کی ہوائیں چل رہی ہیں صحنِ عالم میں
بکھرنے پر ہے شیرازہ، کتابِ اشکباری کا
چمن سے آرہی ہیں پھر صدائیں عندلیبوں کی
کلی کو چھو رہا ہے پھر نفس بادِ بہاری کا
شعاعِ حسنِ لیلیٰ موجزن ہے چشمِ مجنوں میں
ہوائے نجد نے اُلٹا ہے پردا پھر عماری کا
فضا میں پھر تڑپتی ہیں شعاعیں مہر کاوش کی
دلوں میں پھر بھڑک اُٹھا ہے شعلہ بیقراری کا
برستی ہیں فلک سے کاہشیں پھر سرفروشی کی
اُبلتا ہے زمیں سے ولولہ پھر جاں سپاری کا
جھپکنے ہی پہ ہے اب آنکھ عفریتِ غلامی کی
فسانہ ختم ہے اب غیر کی خدمت گزاری کا
رکابیں تھام کر چلنے لگے تھے جو حریفوں کی
سبق دُہرا رہے ہیں پھر سے مشقِ شہسواری کا

دھمک پیدا ہے پھر چھوٹی ہوئی نبضوں میں مشرق کی
کلیجہ خون ہے پھر مغربی "تیمارداری" کا
نظر ہے کلبۂ مزدور پر معمارِ فطرت کی
تلاطم میں ہے قصرِ آہنی سرمایہ داری کا
شبستانِ کجکلہ پر تنگ ہے عالم کی پہنائی
درِ دہقاں پہ دستک دے رہی ہے شانِ دارائی
جہاں بانی، دہکتی آگ ہے گرتی ہوئی بجلی
ہمیشہ اس نے دنیا میں کیا دردِ محن پیدا
ہزاروں تجربوں کے بعد اب انساں یہ سمجھا ہے
کہ شاہی سے نہیں ہوتا شرافت کا چلن پیدا
نہ ہو چینِ جفا جب تک جبینِ شہریاری پر
نہیں ہوتا کلاہِ خسروی میں بانکپن پیدا
جٹا تیں سرد ہتیں گی سنگریزے خون روئیں گے
نگمہ، ہو گا نہ خسرو میں گدازِ کوہکن پیدا
امید اُس سے نہ رکھ نادان! امرغانِ خوش الحاں کی
ہمیشہ جس بیاباں سے ہوئے زاغ و زغن پیدا
اُسے بوئے گل و پیراہنِ یوسف سے کیا نسبت
ہوا کرتا ہے جس صنعت سے کافوری کفن پیدا
ترا، اے حامیِ تاج و علم، کیا یہ عقیدہ ہے؟
کہ ہو سکتی ہے نافِ گرگ سے مشکِ ختن پیدا

تجھے بیگانۂ وضعِ جہاں! کیا یہ توقع ہے؟
کہ ہوں گے مکتبِ دشنام سے شیریں سخن پیدا
سمجھتا ہے کہ وہ حق بات کی تلخی کو سہ لے گا؟
خوشامد سے کبھی جس ماتھے پہ ہو اکثر شکن پیدا
سُن اے غافل! کہ تا روزِ قیامت نسلِ شاہی سے
نہ ہو گا بزمِ انسانی کا صدرِ انجمن پیدا
مروّت آئے گی اُس وقت چشمِ شہریاری میں
علش کی خاک سے جس وقت ہوں گے سیم تن پیدا
ڈریں گے کبر سے اُس روز یہ فرعون کے وارث
سرِ یزداں میں ہو گا جب دماغِ اہرمن پیدا
نظر ڈالی نہیں تو نے کبھی آئینِ فطرت پر
کیا ہے آج تک شعلے نے برگِ یاسمن پیدا؟
بہا ہے موت کے چشمے سے دریا آبِ حیواں کا؟
ہوا ہے سینۂ شمشیر سے دُرِّ یمن پیدا؟
جہاں اُگتے ہوں نیزے اُس زمینِ قہر فطرت سے
سمجھتا ہے کہ ہوں گے سرو و شمشادِ چمن پیدا؟
رگِ آہن سے ٹپکی ہیں شرابِ ناب کی موجیں
خمِ زنجیر سے ہوتی ہے زلفِ پُر شکن پیدا؟
اُٹھائے گا کہاں تک جوتیاں سرمایہ داری کی
جو غیرت ہو تو بنیادیں ہلا دے شہریاری کی

تنِ نازک پہ تیرے رحم آتا ہے مجھے لیکن
نہ دوں دعوت تجھے کس طرح قوت آزمانے کی
تجھے اے کاش شاعر کی طرح محسوس ہو سکتا
نظر پڑتی ہے تجھ پر کس حقارت سے زمانے کی
ازل سے نوعِ انسانی کے حق میں طوق لعنت ہے
کسی ہم جنس کی چوکھٹ پہ عادت سر جُھکانے کی
نہو مغرور گر مائل بہ نرمی بھی ہو سلطانی
کہ یہ بھی ایک صورت ہے تجھے غافل بنانے کی
گئے وہ دن کہ تو زنداں میں جب آنسو بہاتا تھا
ضرورت ہے قفس پر اب تجھے بجلی گرانے کی
گئے وہ دن کہ تو محرومیٔ قسمت پہ روتا تھا
ضرورت ہے تجھے اب آفتوں پر مسکرانے کی

تڑپ، پیہم تڑپ، اتنا تڑپ برقِ تپاں بن جا
خدارا، اے زمینِ بے حقیقت آسماں بن جا

لہ شعلہ و شبنم ۔ ص ۲۳ ۔

نازک اندامانِ کالج سے خطاب

چھین لی تم نے نسائیت سے ہر شیریں ادا
مرحبا، اے نازک اندامانِ کالج، مرحبا!
جنگ سر پر اور یہ محبوبیت چھائی ہوئی
ناز سے نیچی نگاہیں، چال اٹھلائی ہوئی
انکھڑیوں میں عشوۂ تر کا نہ ڈر کھوئے ہوئے
"سینٹ" کی خوشبو میں روحِ ناز پر تولے ہوئے
"خال و خد" سے جذبہائے صنفِ نازک آشکار
"کر زنی" چہروں میں "زن" بننے کے ارماں بیقرار
الحذر! یہ جنبشِ مژگاں کا شیریں ارتعاش
عزتِ آبا کا دل ہے جس کی رو میں پاش پاش
الاماں، یہ زینتیں، موزے ہیں گو اترے ہوئے
ذوق ہے گھنگھرو کا "گیٹس" پاؤں میں پہنے ہوئے
ریشمی رومال سے ہے فرقِ نازک پر بہار
اوڑھنی پر دیدنی ہے راہ کا گرد و غبار
نازکی کا مقتضیٰ، پتلی چھڑی باندھے ہوئے
شوق کنگن کا، کلائی پر گھڑی باندھے ہوئے
جنگ اور نازک کلائی، ہیچ ہیں تقدیر کے
مڑ نہ جائے گی "نگوڑی" بوجھ سے شمشیر کے؟

پاؤں رکھتے ہو درِ گُل گشت کس کس ناز سے
اے میں قرباں! اُن میں نکلو گے اسی انداز سے؟

دیر سے توپوں کے منہ کھولے ہوئے ہے روزگار
سینۂ گیتی میں ہے جس کی دھمک سے خلفشار

شغل زینت سے تمھیں فرصت مگر ملتی نہیں
کیا تمھارے پاؤں کے نیچے زمیں ہلتی نہیں

سُن تو جو موزوں نہیں مردانہ سیرت کے لیے
زندگی اُن کی وبا ہے آدمیت کے لیے

مرد کہتے ہیں اُسے اے مانگ چوٹی کے غلام
جس کے ہاتھوں میں ہو طوفانی عناصر کی لگام

مرد کی تخلیق ہے زور آزمانے کے لیے
گردنیں سرکش حوادث کی جھکانے کے لیے

[illegible] ہے سیلاب کے اندر اکڑنے کے لیے
[illegible] بپھری ہوئی موجوں سے لڑنے کے لیے

مرد کہتے ہیں اُسے اے بندگانِ طمطراق
[illegible] برق و باراں کا اُڑاتا ہو مذاق

جنگ میں ہو بانکپن جس کی شجاعت کا گواہ
رزم کے میداں میں کج کرتا ہو ماتھے پہ کُلاہ

دوڑتا ہو شعلہ خو بجلی کا دامن تھامنے
مسکراتا ہو گرجتے بادلوں کے سامنے

مضحکہ کرتا ہو خوں آشام تلواروں کے ساتھ
کھیلتی ہوں جس کی تیغیں سُرخ انگاروں کے ساتھ

تم مگر اس زندگی کے کھیل سے رہتے ہو دور
آفریں اے عصرِ حاضر کے جوانانِ غیور
ہے تمہارا ارتقا پروردۂ سعیِ زوال
الاماں، تعلیم کالج کا اجل پرور مآل
جیب میں کوڑی نہیں اور اس قدر شان و شکوہ
سر جھکا لے شرم سے اے فاقہ مستوں کے گروہ
یوں تمہارے منھ کے اندر ہے فرنگی کی زبان
خوف ہے گونگا نہ ہو جائے کہیں ہندوستان
مغربی جلووں کو چمکاتا نہیں
تم ہو اس بہروپیے پن سے حجاب آتا نہیں
کیا غضب ہے تم سے بوئے ایشیا آتی نہیں
سچ کہو، کیا واقعی تم کو حیا آتی نہیں؟
زندگی طوفان ہے اور ناؤ ہو تم پاپ کی
آہ جیتی جاگتی بدبختیو ماں باپ کی
یہ بھی کوئی زندگی ہے غم کی ماری زندگی
نوعِ انسانی کی ذلت ہے تمہاری زندگی
یہ بھی کوئی زندگی ہے مست و غافل زندگی
بے حمیت، بدگہر، بے روح، بزدل زندگی
یہ بھی کوئی زندگی ہے پست و ابتر زندگی
فکر سے کچلی ہوئی، بیمار و لاغر زندگی

یہ بھی کوئی زندگی ہے، بے نظام و بے اساس
جذبۂ تقلیدِ مغرب میں زبون و بدحواس
آہ بھرتی زندگی، آنسو بہاتی زندگی
بھوک کی دلدل کی تہہ میں کلبلاتی زندگی
بھاگتی، بجھتی، دبکتی، تھرتھراتی زندگی
کانپتی، ڈرتی، لرزتی، کپکپاتی زندگی
جس کو اک دن بھی نہ حاصل فارغ البالی ہوئی
موت کے بے رحم و سرد آغوش کی پالی ہوئی
راستہ دیتی ہوئی، پیہم سرکتی زندگی
پیٹ کے بل رینگنے والی سسکتی زندگی
مفلسی کی یورشِ پیہم سے گھبرائی ہوئی
غیر کی [illegible] دشمن کی ٹھکرائی ہوئی

آہ اے بیگانۂ انجام و آغازِ حیات
سن، کہ تا کھل جائے تیری موت پر رازِ حیات
اہلِ عالم کی نظر میں محترم ہوتا نہیں
مرد جب تک صاحبِ سیف و قلم ہوتا نہیں
سیف کا دامن تو ہے اک عمر سے چھوٹا ہوا
اور قلم ہے اک، تو وہ بھی خیر سے ٹوٹا ہوا
کچھ خبر بھی ہے تجھے اے طفلکِ زار و نزار
زیست کا ہے دست و بازو کی صلابت پر مدار

غور سے سن اے نگارِ مجلسِ تہذیبِ خام
کھُردرے ہاتھوں میں رہتی ہے حکومت کی لگام
بل پہ لوہے کے جو لے سکتا ہے دنیا سے خراج
جگمگاتا ہے اسی کے فرق پر سونے کا تاج
فکرِ ناقص کو تری سرمایۂ تحقیق دے
کاش دنیا مرد بننے کی تجھے توفیق دے

عزم تیرا آگ کے سانچے میں جب ڈھل جائے گا
طوقِ محکومی کا لوہا خود بخود گل جائے گا

---

[۱] شعلہ و شبنم۔ ص ۲۳۔

بغاوت

ہاں بغاوت ! آگ، بجلی، موت آندھی میرا نام
میرے گرد و پیش اجل، میری جلو میں قتلِ عام
زرد ہو جاتا ہے میرے سامنے روئے حیات
کانپ اُٹھتی ہے مری چینِ جبیں سے کائنات
جنگ کے میداں میں میری سیف کی اللہ ری ضو
خاک بن جاتی ہے بجلی، برف دے اُٹھتی ہے لو
ذکر ہوتا ہے میرا پُرہول پیکاروں کے ساتھ
ذہن میں آتی ہوں تلواروں کی جھنکاروں کے ساتھ
اللہ اللہ کروٹیں میرے دلِ آزاد کی
جن سے گر جاتی ہیں ڈاٹیں قصرِ استبداد کی
میری اک جنبش سے ہوتا ہے جہاں زیر و زبر
میری سرتابی ثریا کا جھکا دیتی ہے سر
ایک چنگاری مری جنت کو کرتی ہے تباہ
مانگتا رہتا ہے میری آگ سے دوزخ پناہ
الحذر ! میری کڑک کا زور ہنگامِ مصاف
صاف پڑ جاتا ہے ایوانِ حکومت میں شگاف
اللہ اللہ بزمِ ہستی میں مری گلباریاں
ٹکڑے ٹکڑے دست و بازو، ریزہ ریزہ استخواں

الاماں والحذر! میری کڑک میرا جلال
خون، سفاکی، گرج، طوفان، بربادی، قتال
برچھیاں، بھالے، کمانیں، تیر، تلواریں کٹار
بیرقیں، پرچم، علم، گھوڑے، پیادے، شہ سوار
آندھیوں سے میری اُڑ جاتا ہے دنیا کا نظام
رحم کا احساس ہے میری شریعت میں حرام
موت ہے خوراک میری، موت پر جیتی ہوں میں
سیر ہو کر گوشت کھاتی ہوں، لہو پیتی ہوں میں
پیاس سے باہر نکل پڑتی ہے جب میری زباں
بہنے لگتی ہیں سرِ میداں لہو کی ندّیاں

جنگ کی صورت سے گو ہنگامہ کرتی ہوں شروع
امن کی صبحیں مرے خنجر سے ہوتی ہیں طلوع
میرا مولد مفلسی کا دل ہے، عشرت کا دماغ
میری پیدائش کے حجُرے میں نہیں جلتا چراغ
گود میں ناداریوں کی پرورش پاتی ہوں میں
بے زری کے بازوؤں پر زلف بکھراتی ہوں میں
بھوک سے ہر چند کیا کیا سرگراں ہوتی ہوں میں
بھوک ہی کا دودھ پی پی کر جواں ہوتی ہوں میں
گرم نالے منھ اندھیرے سے جگاتے ہیں مجھے
اشک غم ہر صبح آئینہ دکھاتے ہیں مجھے

مجکو بچپن کے زمانے ہی سے ہر صبح و مسا
پیٹ کی ماری ہوئی مخلوق دیتی ہے غذا
جس کو حاصل زندگی کا کچھ مزا ہوتا نہیں
کچھ بھی جس کے پاس ماضی کے سوا ہوتا نہیں
جس کی چشم تر میں یوں کھاتے ہیں ارماں پیچ و تاب
دھار پر تلوار کی جیسے شعاعِ آفتاب
ختم ہو جاتا ہے جب اہلِ جہاں کا غلغلہ
رات کے آغوش میں کھلتا ہے میرا مدرسہ
کھل کے پوری سانس لینے سے بھی گھبراتی ہوں میں
درس لینے کے لیے پنجوں کے بل جاتی ہوں میں
ہر قدم پر بھوت، آوازیں سناتے ہیں مجھے
تیرہ دیواروں کے سائے تک ڈراتے ہیں مجھے
ایک دنیا سے نرالی ہے مرے مکتب کی شان
بند ہو جاتی ہیں آنکھیں اور کھلے رہتے ہیں کان
[illegible] قرطاس ہو سکتی نہیں میری کتاب
خون کی چادر پہ چھپتا ہے مرا خونی نصاب
اُف! درودیوار میرے مدرسے کے، الاماں!
[illegible] سہمی ہوئی سرگوشیاں
دیکھنے سے جن کے پتھر کا بھی دل ہو جائے شق
مجکو وہ اُترے ہوئے چہرے پڑھاتے ہیں سبق

اوّل اوّل جان دینے کا سبق لیتی ہوں میں!
آخر، آخر، جان لینے کا سبق لیتی ہوں میں!

کچھ دنوں تو فرطِ حیرت سے میں رہتی ہوں خموش
آخر آجاتا ہے میری روحِ سرتابی کو جوش
پھر تو میں چنگھاڑتی ہوں خوفناک انداز میں
موت کی آواز ہوتی ہے مری آواز میں
برق کے سانچے میں ڈھل جاتی ہیں گفتاریں مری
میان سے باہر اُبل پڑتی ہیں تلواریں مری
موت بن کر زندگی کے سر پہ چھا جاتی ہوں میں
سب سے پہلے بڑھ کے غدّاروں کو کھا جاتی ہوں میں
سوزِ ملّت سے جو پہلو مشتعل رکھتے نہیں
ہاں وہی غدّار سینوں میں جو دل رکھتے نہیں

سلطنت کی سمت پھر بڑھتی ہوں بل کھاتی ہوئی
قید اور قانون کو ذلّت سے ٹھکراتی ہوئی
اپنی رَو کی گرد میں صحنِ زمیں اُلٹے ہوئے
میاں سے خنجر نکالے آستیں اُلٹے ہوئے
باندھتی ہوں شہریوں کے سر پہ یہ کہہ کر کفن
تم ہو اشجع، ناوک افگن، صف شکن، شمشیر زن
تم ہو غازی، جنگجو، لشکر شکن، میرِ سپاہ
تم ہو رستم، مردِ میداں، شیر دل، عالم پناہ

تم ہو سر لشکر، سپاہی، برق پیما، سخت کوش
تم ہو صفدر، سورما، ساونت، سرکش، سرفروش
ایڑیاں، تم اور رگڑو آب و ناں کے واسطے
ریڑھ کی ہڈی ہو تم، جسم جہاں کے واسطے
اے جواں مردو! یہ ذلت کس لیے سہتے ہو تم؟
مرد ہو کر ٹھوکروں کی زد پہ کیوں رہتے ہو تم؟
مادہ سیرت بن کے تو رہتے نہیں، دنیا میں نر
ٹھوکروں کے واسطے ہوتا نہیں مردوں کا سر
لختِ دل انسان کھائے اور خونِ دل پیئے
تف ہے اس جینے پہ مر مر کر جیے تو کیا جیے
سچ کہو، تم ننگِ محکومی سے شرماتے نہیں؟
کیا تم اپنی عورتوں کے سامنے جاتے نہیں؟
کب نکالو گے تمنائیں دلِ برباد کی
کیا ہوئیں تیغیں، تمہارے نامور اجداد کی؟
اے جواں مردو، خدارا باندھ لو سر سے کفن
سر برہنہ پھر رہی ہے عزتِ قوم و وطن
ہاں زمیں کو زیر کر کے آسمانوں پر چڑھو
ہاں بڑھو، اے صف شکن ہیرو! بڑھو جلدی بڑھو
پاؤں میں تا چند، زنجیرِ غلامی کی خراش؟
صرف اک جنبش، ابھی ہوتی ہیں کڑیاں پاش پاش

میری آوازوں سے کانپ اُٹھتا ہے روحوں کا سکون
جذبۂ غیرت کی آنکھوں میں اُتر آتا ہے خون
شور اُٹھتا ہے، محض اک وہم ہے دار و رسن
یا تو اب ہم تاج ہی پہنیں گے، یا خونی کفن
کپکپاتی ہے زمیں، اُٹھتا ہے ہلکا سا غبار
دوڑنے لگتے ہیں مرکب، بڑھنے لگتے ہیں سوار
طبل کی دوں دوں سے جل اُٹھتے ہیں آنکھوں میں چراغ
جھن جھناتے ہیں جلاجل سنسناتے ہیں دماغ
کھلنے لگتا ہے مگر جس وقت پرچم جنگ کا
پہلے بڑھ کر میں حکومت کو یہ دیتا ہوں صدا
اے جفا پرور امارت! دیکھ ناداروں سے بھاگ
بھاگ دیوانوں کی خوں آشام تلواروں سے بھاگ
موت کا پیغام ہے، بپھرے ہوئے شیروں کا وار
مدعی! کف دردہاں آبادیوں سے ہوشیار
خلق ہے بیتاب، تیرا منھ جھلسنے کے لئے
تیرے سونے پر ہے اک لوہا برسنے کے لیے
تیرے مطبخ، مفلسوں کی بھوک کھا جانے کو ہے
تیرے زر کی سرخیوں میں آگ لگ جانے کو ہے
حرّیت کی تند لہروں میں ٹھہر سکتا ہے کون؟
جذبۂ خلقِ خدا کو فتح کر سکتا ہے کون؟

اب بھی آنکھیں کھول، اے جنِ خودی، دیوِ ریا!
جذبۂ خلقِ خدا ہے اصل میں عزمِ خدا
راہ سے اپنی مشیت کو ہٹا سکتا ہے کون؟
عظمِ خلاقِ جہاں کا سر جھکا سکتا ہے کون؟
گونجنے لگتی ہیں جب میری صدائیں مثلِ صور
سر اُٹھا کر مسکراتا ہے حکومت کا غرور
مضحکہ، اور قطرۂ شبنم کا انگاروں کے ساتھ
پنکھڑی اور ناز سے پیش آئے تلواروں کے ساتھ
عقل کا دستِ سبک، رخشِ جنوں کی باگ پر
قہقہہ خس کا، کڑکتی بجلیوں کی آگ پر
ایک مٹی کے دیے کا طنز اور کعبے کا طاق
نرم و نازک آبگینہ، اور پتھر سے مذاق
اس تمسخر سے مرے سینے میں لگ جاتی ہے آگ
قلعۂ شاہی کی جانب موڑ دیتی ہوں میں باگ
پھر تو جاتا ہے جدھر میرا جنونِ تند خو
پشت پر ہوتی ہیں لاشیں، ہڈیاں، ڈھانچے لہو
میرے گرد و پیش کی ہنگامہ خیزی الاماں
شور، غوغا، غلغلہ، فریاد، واویلا، فغاں
اللہ اللہ میرے دہشت ناک خونی ولولے
آندھیاں، طوفاں، تلاطم، سیل، صرصر، زلزلے

ابتری، وحشت، تزلزل، طنطنہ، دہشت، فساد
دبدبے، گرمی، کشاکش، دغدغے، ہلچل، جہاد
کنگرے، ایوانِ شاہی کے جُھکا دیتی ہوں میں
جبر و استبداد کی چولیں ہلا دیتی ہوں میں
دندناتی گنبدِ زرّیں میں گھس جاتی ہوں میں
چاٹ کر سونے کا پانی آگ برساتی ہوں میں
میرے خرقِ بے کلہ کے سامنے بے اختیار
کانپتا ہے، طرہ، طرفِ کلاہِ شہریار
باندھ کر پیماں گدا کی خفتہ سامانی کے ساتھ
کھیلنے لگتی ہوں ہولی، خونِ سلطانی کے ساتھ
کس سے رُکتی ہوں جب اپنی بات پر آتی ہوں میں
سلطنت کے سر کا گودا تک چبا جاتی ہوں میں
زیر دستوں کو دلا کر خونِ حاکم سے خراج
قیدیوں کے سر پہ رکھ دیتی ہوں آزادی کا تاج
شعلے کے مانند پھر لیتی ہوں یوں انگڑائیاں
سینۂ ارض و سما سے اُٹھنے لگتا ہے دُھواں
الاماں! میرا جنوں پرور تمرّد، الاماں!
آ، سُنا دوں میں تجھے، دو حرف میں یہ داستاں
جب ازل میں سجدۂ آدم کا اُٹھا تھا سوال
ہاں اُسی ہلچل کے موقع پر کہ تھا وقتِ جلال

خود خدائے برتر و قہار سے افلاک پر
کی تھی میں نے گفتگو آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر

رُعبِ سلطانی سے یہ چہرہ اُتر سکتا نہیں
جو خدائی سے لڑے، شاہی سے ڈر سکتا نہیں

لہ شعلہ و شبنم - ص ۳۰ -

زنداں کا گیت[۱]

لو آگیا وہ کوئی گلستاں لئے ہوئے
چہرے پہ رنگِ صبحِ درخشاں لیے ہوئے

کلیاں ہر اک روش پہ چٹکنے لگیں تمام
گوہر فشانیٔ لبِ خوباں لیے ہوئے

نکلا فضا پہ صبح کا وہ نقرئی جلوس
گل بانگِ طائرانِ خوش الحاں لیے ہوئے

فیضِ صبا سے مقدمِ صبحِ بہار میں
ہر خار و خس ہے جنبشِ مژگاں لیے ہوئے

یہ رنگ کیا ہے کشورِ ہندوستان کا آج
ہر ذرۂ حقیر ہے بُستاں لیے ہوئے

یعنی ہر ایک ذرہ ہے خونِ وفا سے سُرخ
اور سرخیاں ہیں روضۂ رضواں لیے ہوئے

اس موجِ خوں سے دل میں نہ لانا کبھی ہراس
یہ موجِ خوں ہے لعلِ بدخشاں لیے ہوئے

اس ترکِ تشدد سے ہونا نہ بدحواس
یہ ترک ہے خروشِ فراواں لیے ہوئے

ان عصمتوں سے اہلِ وفا کی نہ ہو اُداس
یہ عصمتیں ہیں جذبۂ عصیاں لیے ہوئے

گو ہند آج باغِ جہاں میں ہے مثلِ خَس
یہ خار و خس ہے سنبل و ریحاں لیے ہوئے

ان جالیوں پہ محبسِ تاریک کی نہ جا
یہ جالیاں ہیں جنبشِ مژگاں لیے ہوئے

ان کروٹوں کو اہلِ قفس کی سبک نہ جان
یہ کروٹیں ہیں موجۂ طوفاں لیے ہوئے

ان ظلمتوں پہ مطلعِ اُمید کی نہ جا
یہ ظلمتیں ہیں چشمۂ حیواں لیے ہوئے

ظاہر میں بزدلی ہے یہ درماندگی مگر
یہ بزدلی ہے جنگ کا ساماں لیے ہوئے

آگاہ ہو ندیم! کہ یہ زہرِ صبر
دل میں ہے عزمِ شعلۂ عریاں لیے ہوئے

آزادیوں کے دیکھ رہا ہے لطیف خواب
زندانیانِ عشق کو زنداں لیے ہوئے

اے پیرِ خستہ! مژدہ کہ سنکی ہوائے مصر
بوئے قمیصِ یوسفِ کنعاں لیے ہوئے

کہد و صدف سے آنکھ اُٹھائے سوئے فلک　　آیا ہے ابر قطرۂ نیساں لیے ہوئے
بلقیس سے کہو کہ سرِ بارگاہ ناز　　پریاں کھڑی ہیں تختِ سلیماں لیے ہوئے

جوشِ اہلِ دل کے پاؤں کی زنجیر پہ نہ جا
یہ سلسلہ ہے زلفِ پریشاں لیے ہوئے

لہ شعلہ و شبنم - ص ۳۷ -

ہوشیار

آ رہی ہے نیند تجھکو درمیانِ کارزار   دیکھ وہ تیغِ عدو چمکی، خدارا ہوشیار

ہوشیار

اے مردِ غافل ہوشیار

خون کے دھارے کے اندر سے ہے جس کا راستہ   آنسوؤں کے سیل میں تو ڈھونڈھتا ہے وہ دیا

ہوشیار

اے مردِ غافل ہوشیار

آ رہی ہے دشتِ استبداد سے بادِ سموم   اور محکومی سمجھتی ہے نسیمِ خوشگوار

ہوشیار

اے مردِ غافل ہوشیار

تن سے رخصت ہو رہی ہے روحِ مردِ ضعیف   حلق پر رکھا ہوا ہے خنجرِ سرمایہ دار

ہوشیار

اے مردِ غافل ہوشیار

جانور لیں سانس یکرنگی و آزادی کے ساتھ   نوعِ انساں، اور تقسیمِ غلام و شہریار

ہوشیار

اے مردِ غافل ہوشیار

ضعف و قوت میں توازن ہو یہ ممکن ہی نہیں   پھول سے گلچیں کا ہر پیماں ہے نااستوار

ہوشیار

اے مردِ غافل ہوشیار

رحم کی درخواست سے پہلے یہ دل میں سوچ لے　　خون ہے خادم کا آقا کے گلستاں کی بہار

ہوشیار

اے مردِ غافل ہوشیار

گرگ رہ جاتے ہیں دانتوں میں دبا کر انگلیاں　　آدمی کا آدمی کرتا ہے اکثر یوں شکار

ہوشیار

اے مردِ غافل ہوشیار

دیکھتا ہوں عصرِ حاضر کی نگاہِ مہر میں　　وہ دہکتی آگ کا نہیں جس کو دوزخ کے شرار

ہوشیار

اے مردِ غافل ہوشیار

عرصۂ عالم کا ہر ذرہ ہے میزانِ عمل　　بزمِ ہست و بود کا ہر روز ہے روزِ شمار

ہوشیار

اے مردِ غافل ہوشیار

۱؎ شعلہ و شبنم ۔ ص ۳۹ ۔

ایک شہیدِ وطن کی یاد میں[1]

اے بہادر! اے شہیدِ خنجرِ اربابِ کیں
جان جو اس شان سے دیتا ہے مر سکتا نہیں
پڑ رہی ہے اُس طرف گردن میں پھانسی کی گرہ
کھل رہا ہے اس طرف آغوشِ فردوسِ بریں
نوجوانو! توڑ ڈالو سبحہ و زنار کو
تا کجا یہ احمقانہ دار و گیرِ کفر و دیں
نوجوانو! عشق کو درکار ہے مجنوں کا دل
تا بہ کے یہ عشوہ ہائے لیلیٰ محمل نشیں؟
نوجوانو! خون جینے کے لیے تھوڑا سا خون
خون کی پیاسی ہے مدت سے وطن کی سرزمیں
پوچھے اب تم سے اگر کوئی کہ "ہیں جانیں عزیز"؟
یک زباں ہو کر پکار اُٹھو "نہیں، ہرگز نہیں"

---

[1] شعلہ و شبنم۔ ص ۱۴۱۔

بزمِ باقی

چونک اے دل کہ ابھی تک ہے وہ محفل باقی
وہی محمل ہے، وہی رونقِ محمل باقی
اب بھی ہر چیز ہے آئینۂ رخسارِ حبیب
اب بھی ہر شئے ہے یہاں ناز کے قابل باقی
اب بھی ہر دل پہ ہے اُس کاکلِ شبرنگ کا دام
اب بھی ہر روح میں ہے شورِ سلاسل باقی
آج تک کشمکشِ عشق کا محکم ہے نظام
وہی ناخن ہے، وہی عقدۂ مشکل باقی
سُن، کہ اب تک ہے بیاباں میں جرس گرمِ فغاں
اُٹھ، کہ اب تک ہیں بہت واقفِ منزل باقی
ذرّۂ خاک کو جو ہر جو بنا دیتا ہے
آج بھی تجھ میں ہے وہ جوہرِ قابل باقی
راہ کو منزلِ مقصود سمجھنے والے!
جانتا ہے ابھی کتنے ہیں مراحل باقی؟
غور کرنے سے اُلجھتا ہے ترا دل ورنہ
اب بھی ہے کشمکشِ حلِ مسائل باقی
دل میں جو آگ تھی ہرچند پڑی ہے خاموش
پھر بھی اک آنچ سی ہے متصلِ دل باقی

تو نے سُننے کی قسم کھائی ہے ناداں ورنہ
اب بھی گلشن میں ہے گلبانگِ عنادل باقی

تو نے کیا سوچ کے یوں میان میں رکھ لی تلوار
دیکھ اب تک ہے نزاعِ حق و باطل باقی

نبضِ ہستی کی دھمک جوش ہو کیونکر محسوس
جو دھڑکتا تھا وہ پہلو میں نہیں دل باقی

۱ھ شعلہ و شبنم ۔ ص ۴۲ ۔

مستقبل کے غلام[1]

یہ ہند کے سمن بر شیریں کلام بچے
یہ گل عذار بچے، یہ لالہ فام بچے

بے وجہ شادمانی بشاش رہنے والے
یہ موجِ سرخوشی بہ منس ہنس کے بہنے والے

یہ دہر کی دعا کو تاثیر دینے والے
یہ خوابِ زندگی کی تعبیر دینے والے

رہ رہ کے ہو فلک کی جانب ہمکنے والے
یہ شاخِ عمرِ نو کے تازہ چہکنے والے

یہ اینڈنے، مچلنے، بڑھنے، اُبھرنے والے
یہ رنگ تازہ نقشِ عالم میں بھرنے والے

کس شانِ دلکشی سے پھرتے ہیں شور کرتے
یہ گنگناتے غنچے، یہ بولتے شگوفے

امواجِ زندگی پر الماس کے سفینے
شیرینیوں سے مملوٗ ذی روح آبگینے

فطرت نے دل سے چاہا اُن کا لطیف ہونا
دی ماہِ نو کی چاندی، پہلی کرن کا سونا

لیکن وطن کی حالت پیہم ڈرا رہی ہے
دل سے یہ روح فرسا آواز آ رہی ہے

اک دن "ذلیل" و "وحشی" ان کے بھی نام ہوں گے
اپنی ہی طرح اک دن یہ بھی غلام ہوں گے

---

[1] شعلہ و شبنم۔ ص ۴۳۔

شریکِ زندگی سے خطاب

اے شریکِ زندگی! اس بات پر روتی ہے تو
کیوں مرا ذوقِ ادب ہے مائلِ جام و سبو
کس لیے اس پر نہیں روتی کہ اہلِ خانقاہ
داڑھیوں سے ہندیوں کو کر رہے ہیں روسیاہ
کس لیے اس پر نہیں روتی کہ مصنوعی صلواۃ
خم کیے دیتی ہے اپنے وزن سے پشتِ حیات
کس لیے اس پر نہیں روتی کہ دشمن کا عتاب
تیری ہم جنسوں کی راہوں میں الٹتا ہے نقاب
کس لیے اس پر نہیں روتی کہ ہے گرمِ فغاں
سبحہ و زنار میں جکڑا ہوا ہندوستاں
کس لیے اس پر نہیں روتی کہ تیرے نونہال
بن رہے ہیں مغربی تہذیب سے رنگیں جمال
کس لیے اس پر نہیں روتی کہ تھے جو شہ سوار
آج ان لڑکوں میں ہے لیلیٰ و سلمیٰ کا نکھار
کس لیے اس پر نہیں روتی کہ ہندی نوجواں
کھو چکا ہے صف شکن اسلاف کی روحِ تپاں
کس لیے اس پر نہیں روتی کہ شمشیرِ وطن
بن چکی ہے بزمِ محکومی کی شمعِ انجمن

کس لیے اس پر نہیں روتی کہ ملّت کا شباب
شیب کی نا وقت یورش سے ہُوا ہے خضاب
کس لیے اس پر نہیں روتی کہ بیٹے کی جبیں
باپ کے ماتھے کی سی تابندگی رکھتی نہیں

چھوڑ کر چہرے کے دھبے آئینہ دھوتی ہے تو
میری درویشانہ میخواری پہ کیا روتی ہے تو[1]

---

[1] شعلہ و شبنم - ص ۹۳ -

زمانہ بدلنے والا ہے

ستم شعار! یہ اندازِ ساحری کب تک؟
رہے گی گرمیٔ بازارِ سامری کب تک؟
یہ درسِ امن کی ابلہ فریبیاں تاچند؟
یہ اشتہارِ کرم کی فسوں گری کب تک؟
یہ بزمِ عیش، یہ آہنگِ خسروی تا کے
یہ سازِ کیف، یہ گلبانگِ قیصری کب تک؟
یہ کافرانہ نگاہِ خدارسی تا کے
یہ بزدلانہ ادائے سپہ گری کب تک؟
یہ طنطنے، یہ تحکم، یہ دبدبے تاچند
یہ نادری، یہ خدائی، یہ قاہری کب تک؟
یہ شغلِ ظلم، یہ آئینِ دلدہی تا کے
یہ مشقِ جور، یہ اندازِ دلبری کب تک؟
یہ چیرہ دستیٔ تثلیثِ ناروا تاچند
یہ فتنہ خیزیٔ توحیدِ آذری کب تک؟

یہ شیطنت میں نمودِ پیمبری تا کے
پیمبری میں یہ اندازِ داوری کب تک؟

ٹھہر کہ چرخ نئی چال چلنے والا ہے
سنبھل سنبھل کہ زمانہ بدلنے والا ہے

۱؎ شعلہ و شبنم ۔ ص ۴۵ ۔

اللہ کرے

اللہ کرے اے ہند! اس فتنۂ دوراں میں
ہو گوئے ظفرمندی تیرے خمِ چوگاں میں
کانٹوں کو بناتی ہے جو بادِ صبا گلشن
آئے وہ صبا تیرے اُجڑے ہوئے بستاں میں
دل ملتے ہیں جس مئے سے معبود! وہ مے ٹپکا
پیمانۂ ہندو میں، مینائے مسلماں میں
راتوں کو چمکتے ہیں سینے میں جو شاعر کے
وہ عقدہ کشا غنچے مہکیں ترے داماں میں
اوراق سے اُڑ جائیں اغیار کی تحریریں
اب مُہر تری جھلکے ہر دفتر و دیواں میں
ہاں نوح کی کشتی کی تقدیر ملے تجکو
اس بحرِ سیاست کے بپھرے ہوئے طوفاں میں
اے طاقِ وطن! تجھ میں اے کاش پرافشاں ہو
وہ نور کہ غلطاں تھا، قندیل سلیماں میں

اے کاش کبھی تیری، ظلمت کی طرف دیکھے
وہ شمع کہ روشن ہے عشرت گہِ یزداں میں

ساقی کے تبسم سے، اور جوش کے بربط سے
روشن ہوں کنول تیری محرابِ زرافشاں میں

لہ شعلہ و شبنم - ص ۲۶ -

مستقبل

مژدہ اے دل! کہ نیا پھر سرو ساماں ہوگا
جس کو دشوار سمجھتا ہے، وہ آساں ہوگا

ایک بار اور صبا لائے گی پیغامِ وصال
ایک بار اور علاجِ غمِ ہجراں ہوگا

ایک مبہم سا نشاں ہوگا نشانِ آلام
ایک بھولا سا فسانہ غمِ دوراں ہوگا

سنگریزہ کہ سرِ خاک پڑا ہے خاموش
کاوشِ مہر سے کل لعلِ بدخشاں ہوگا

رو کشِ دشت و جبل قصرِ سلاطیں ہونگے
ہمسرِ بامِ فلک کلبۂ دہقاں ہوگا

قدمِ فقر پہ جھک جائے گی شاہی کی جبیں
دستِ افلاس میں دولت کا گریباں ہوگا

خوفِ صیاد سے جو بھول چکا ہے پرواز
کل وہی مرغِ قفس، مرغِ سلیماں ہوگا

پک رہا ہے جو بیاباں کی کڑی دھوپ میں آج
کل اسی سر کے لیے تاجِ گل افشاں ہوگا

آج جو دوب کا اک ریشہ ہے اور کچھ بھی نہیں
کل وہ تلوار کی صورت میں نمایاں ہوگا

آج جس بزم پہ طاری ہے جلالِ فرعون
کل وہیں دبدبۂ موسیٰؑ عمراں ہوگا
آج جس رعب سے ہے روئے امارت پہ شکوہ
کل وہ مزدور کے چہرے سے نمایاں ہوگا
حکمِ ساقی سے ہے جو حلقۂ بیرونِ در آج
کل وہی بزم میں رقصاں و غزلخواں ہوگا

نفسِ بادِ صبا مُشک فشاں خواہد شُد
عالمِ پیر دگر بارہ جواں خواہد شُد

(حافظ)

لے شعلہ و شبنم۔ ص ۷۴۔

وطن[1]

اے وطن! پاک وطن! روحِ روانِ احرار
اے کہ ذرّوں میں ترے بوئے چمن رنگِ بہار
اے کہ خوابیدہ تری خاک میں شاہانہ وقار
اے کہ ہر خار ترا روکشِ صد روئے نگار
ریزے الماس کے تیرے خس و خاشاک میں ہیں
ہڈیاں اپنے بزرگوں کی تری خاک میں ہیں
پائی غنچوں میں ترے رنگ کی دنیا ہم نے
تیرے کانٹوں سے لیا درسِ تمنا ہم نے
تیرے قطروں سے سُنی قراءتِ دریا ہم نے
تیرے ذرّوں میں پڑھی آیتِ صحرا ہم نے
کیا بتائیں کہ تری بزم میں کیا کیا دیکھا
ایک آئینے میں دنیا کا تماشا دیکھا
تیری ہی گردنِ رنگیں میں ہیں باہیں اپنی
تیرے ہی عشق میں ہیں صبح کی آہیں اپنی
تیرے ہی حسن سے روشن ہیں نگاہیں اپنی
کج ہوئیں تیری ہی محفل میں کلاہیں اپنی
بانکپن سیکھ لیا عشق کی اُستادوں سے
دل لگایا بھی تو تیرے ہی پری زادوں سے

پہلے جس چیز کو دیکھا وہ فضا تیری تھی
پہلے جو کان میں آئی وہ صدا تیری تھی
پالنا جس نے ہلایا وہ ہوا تیری تھی
جس نے گہوارے میں چوما وہ صبا تیری تھی
اوّلیں رقص ہوا مست گھٹا میں تیری
بھیگی ہیں اپنی مسیں آب و ہوا میں تیری

اے وطن آج سے کیا ہم تیرے شیدائی ہیں
آنکھ جس دن سے کھلی تیرے تمنائی ہیں
مدتوں سے تیرے جلوؤں کے تماشائی ہیں
ہم تو بچپن سے ترے عاشق و سودائی ہیں
بھائی طفلی سے ہر اک آن جہاں میں تیری
بات تتلا کے جو کی بھی تو زباں میں تیری

حسن تیرے ہی مناظر نے دکھایا ہم کو
تیری ہی صبح کے نغموں نے جگایا ہم کو
تیرے ہی ابر نے جھولوں میں جھلایا ہم کو
تیری ہی پھولوں نے نوشاہ بنایا ہم کو
خندۂ گل کی خبر تیری زبانی آئی
تیرے باغوں میں ہوا کھا کے جوانی آئی

تجھ سے منھ موڑ کے منھ اپنا دکھائیں گے کہاں
گھر جو چھوڑیں گے تو پھر چھاؤنی چھائیں گے کہاں

بزمِ اغیار میں آرام یہ پائیں گے کہاں
تجھ سے ہم روٹھ کے جائیں بھی تو جائیں گے کہاں

تیرے ہاتھوں میں ہے قسمت کا نوشتہ اپنا
کس قدر تجھ سے بھی مضبوط ہے رشتہ اپنا

اے وطن جوش ہے پھر قوتِ ایمانی میں
خوف کیا دل کو سفینہ جو ہے طغیانی میں

دل سے مصروف ہیں ہر طرح کی قربانی میں
محو ہیں جو تیری کشتی کی نگہبانی میں

غرق کرنے کو جو کہتے ہیں زمانے والے
مسکراتے ہیں تری ناؤ چلانے والے

ہم زمیں کو تری ناپاک نہ ہونے دیں گے
تیرے دامن کو کبھی چاک نہ ہونے دیں گے

تجھ کو جیتے ہیں تو غمناک نہ ہونے دیں گے
ایسی اکسیر کو یوں خاک نہ ہونے دیں گے

جی میں ٹھانی ہے یہی، جی سے گزر جائیں گے
کم سے کم وعدہ یہ کرتے ہیں کہ مر جائیں گے

(۱۹۱۸ء)

لہ شعلہ و شبنم ۔ ص ۸۴ ۔

شکستِ زنداں کا خواب[1]

کیا ہند کا زنداں کانپ رہا ہے، گونج رہی ہیں تکبیریں
اکتائے ہیں شاید کچھ قیدی اور توڑ رہے ہیں زنجیریں
دیواروں کے نیچے آ آ کر یوں جمع ہوئے ہیں زندانی
سینے میں تلاطم بجلی کا، آنکھوں میں جھلکتی شمشیریں
بھوکوں کی نظر میں بجلی ہے توپوں کے دہانے ٹھنڈے ہیں
تقدیر کے لب کو جنبش ہے، دم توڑ رہی ہیں تدبیریں
آنکھوں میں گدا کی سرخی ہے، بے نور ہے چہرہ سلطاں کا
تخریب نے پرچم کھولا ہے، سجدے میں پڑی ہیں تعمیریں
کیا اُن کو خبر تھی، زیر و زبر رکھتے تھے جو روحِ ملت کو
اُبلیں گے زمیں سے مارِ سیہ، برسیں گی فلک سے شمشیریں
کیا اُن کو خبر تھی سینوں سے جو خون چرایا کرتے تھے
اک روز اسی بے رنگی سے جھلکیں گی ہزاروں تصویریں
کیا اُن کو خبر تھی ہونٹوں پر جو قفل لگایا کرتے تھے
اک روز اسی خاموشی سے ٹپکیں گی، دہکتی تقریریں
سنبھلو کہ وہ زنداں گونج اٹھا، جھپٹو کہ وہ قیدی چھوٹ گئے
اُٹھو کہ وہ بیٹھیں دیواریں، دوڑو کہ وہ ٹوٹیں زنجیریں

---

[1] شعلہ و شبنم ۔ ص ۵۱ ۔

علی گڑھ کالج کی پنجاہ سالہ جبلی

یہ نہ پوچھو کہ ہم نے کیا دیکھا — جوبلی میں وہ ماجرا دیکھا
قوم سے جس نے کر دیا بیزار — بن گئے ہم تو نقشِ بر دیوار
اتنے بہروپیے نظر آئے — اپنی آنکھوں میں اشک بھر آئے
پوششیں مغربی اماموں کی — صورتیں مشرقی غلاموں کی
پینٹ میں ہاتھ اور منہ میں سگار — شانے ہلتے ہوئے دمِ گفتار
طاقِ دل میں چراغ انگریزی — سر کے اندر دماغ انگریزی
چال انگریزی، ڈھال انگریزی — جسم کا بال بال انگریزی
جسمِ ہندی میں جان انگریزی — منہ کے اندر زبان انگریزی
گفتگو میں بنی ہوئی آواز — خمِ گردن میں مغربی انداز
اپنے لہجوں سے ہاتھا پائی تھی — حلق کی ساخت سے لڑائی تھی
چھل رہا ہے گلا تو چھل جائے — لہجہ "صاحب" سے اپنا مل جائے
جوش! پنجاہ سالہ جبلی کا — آپ سمجھے کہ مدعا کیا تھا؟
یہ جتانا تھا دیکھو بڑھ گئے ہم — سوئے نصرانیت پچاس قدم؟

آنچ گم ہر طرف دھواں ہی دھواں
وائے برسعیِ سید احمد خاں

۱؎ شعلہ و شبنم ۔ ص ۵۲ ۔

علی گڑھ سے خطاب

اے علی گڑھ ! اے جوانِ قسمت دبستانِ کہن
اے کہ شمعِ فکر سے تابندہ تیری انجمن
تیرے پیمانوں میں لرزاں ہے شرابِ علم و فن
حشر کے دن تک پھلا پھولا رہے تیرا چمن
مشعلِ مینا سے روشن تیرا میخانہ رہے
رہتی دنیا تک ترا گردش میں پیمانہ رہے

ایک دن ہم بھی تری آنکھوں کے بیماروں میں تھے
تیری جنسِ علم پرور کے خریداروں میں تھے
تیری زلفِ خم بخم کے نو گرفتاروں میں تھے
تیرے اصنامِ سمن بر کے پرستاروں میں تھے
تیری برقِ جلوۂ رنگیں پہ شیدا ہم بھی تھے
تیرے کوہِ طور کے اک روز موسیٰ ہم بھی تھے

لیکن اے علم و معارف کے درخشاں آفتاب
کچھ بہ اندازِ دگر بھی تجھ سے کرنا ہے خطاب
گو یہ دھڑکا ہے کہ ہوں گا موردِ قہر و عتاب
کہہ بھی دوں جو کچھ ہے دل میں تا کجا یہ پیچ و تاب
بن پڑے جو سعی اپنے سے وہ کرنا چاہئے
مرد کو کہنے کے موقع پر نہ ڈرنا چاہئے

اے علی گڑھ ! اے ہلاکِ جلوۂ وضع فرنگ
"ٹیمز" ہے آغوش میں تیرے بجائے موج گنگ
ظلمتِ مغرب میں ہے آوارہ تیری ہر اُمنگ
ولولوں پر تیرے شاید عرصۂ مشرق ہے تنگ
آکہ حیراں ہے وطن کا کارواں تیرے لیے
گوش. برآواز ہے ہندوستاں تیرے لیے

عاشقِ مغرب نگاہِ شرق کے جادو بھی دیکھ
اے سنہری زلف کے قیدی، سیہ گیسو بھی دیکھ
دیدۂ ازرق کے شیدا، دیدۂ آہو بھی دیکھ
سازِ بے رنگی کے بندے سوزِ رنگ و بو بھی دیکھ
"جسم" تا کے ؟ "روح" لرزاں کے شرارے کو بھی دیکھ
"ٹیمز" سے منھ موڑ کے گنگا کے دھارے کو بھی دیکھ

پختہ کاری سیکھ، یہ آئینِ خامی تا کجا
جادۂ افرنگ پر یہ تند گامی تا کجا
سوچ تو جی میں یہ جھوٹی نیک نامی تا کجا
مغربی تہذیب کا طوقِ غلامی تا کجا
مرد اگر ہے غیر کی تقلید کرنا چھوڑ دے
چھوڑ دے، لِلّٰہ! بالاقساط مرنا چھوڑ دے

خان بہادر اور شمس العلماءؑ

بڑھ رہی ہے بہادری جتنی جبن کی دھوپ چڑھتی جاتی ہے
جس قدر "شمس" ہو رہے ہیں طلوع تیرگی اور بڑھتی جاتی ہے

ؑ شعلہ و شبنم - ص ۵۲ -

مقتلِ کانپور[1]

اے سیہ رُو، بے حیا، وحشی، کمینے، بدگمان
اے جبینِ ارض کے داغ اے دنی ہندوستان
تجھ پہ لعنت، اے فرنگی کے غلامِ بے شعور
یہ فضائے "صلح پرور"، یہ قتالِ کانپور؟
تجھ کو "عورت" نے جنا ہے جھوٹ ہے یہ اے لعیں
آدمی کی نسل سے اور تو!! نہیں، ہرگز نہیں
تیری جانب اُٹھ رہی ہے دیکھ دوزخ کی نگاہ
سبحہ و زنّار ہیں جکڑے ہوئے دبوسیاہ!
رودِ گنگا سے لیے اس طرح طوفانِ ممات
کس کو کھا کر آرہا ہے، اودبائے کائنات
اے درندے، یہ ترا جبڑا ہے کیوں سمٹا ہوا؟
کس کا یہ گودا ترے تالو میں ہے چمٹا ہوا؟
تیغِ برّاں، اور عورت کا گلا، کیوں بد صفات
چھوٹ جائیں تیری نبضیں، ٹوٹ جائیں تیرے ہات
کہنیوں سے یہ تری کیسا ٹپکتا ہے لہو؟
یہ تو ہے اے سنگ دل، بچّوں کا خونِ مُشک بُو
مرد ہے تو اس سے لڑ، پہلے جو مارے پھر مرے
تو نے بچّوں کو چبا ڈالا خدا غارت کرے

تونے او بزدل لگائی ہے گھروں میں جن سے آگ
کیا انھیں ہاتھوں سے لیگا رخشِ آزادی کی باگ؟
دل میں کھوٹا پن، ارادوں میں بدی، نیت خراب
او سیہ باطن! یہ عالم، اور آزادی کا خواب
سُن کہ کم ظرفوں کو دے سکتی نہیں دنیا خراج
یہ ترا چھوٹا سا سر، او ننگِ ہستی اور تاج
اس طرح انسان، اور شدت کرے انسان پر
تُف ہے تیرے دین پر لعنت ترے ایمان پر
تو اُبھرتے ہی زمانے کی نظر سے گر گیا
یوں بہایا خون، اُمیدوں پہ پانی پھر گیا
رکنے ہی والا ہے آزادی کا جاں پرور جھکو
اے فرنگی! شادباں بالش و غلامی! زندہ باد

لے شعلہ و شبنم - ص ۵۶ -

غدّار سے خطاب

ہوشیار اے بے حیا غدّار، اے نفسِ دنی !
دیکھ آ پہنچا، وہ اے بدبخت! وقتِ جاں کنی

وقتِ استغفار ہے، بیدار ہو اے بدنصیب
وہ اجل کا سرد چنگل آ گیا سر کے قریب

ے وطن کی تیغ، وہ نکلی، حکومت کو پکار
ساتھیوں کو دے صدا، دیو رذالت کو پکار

خون میں اپنے ہی تجھ کو دیکھ کر لتھڑا ہوا
گونجتے ہی پر ہے خونی قہقہہ شیطان کا

قبر تیری ٹھوکریں کھاتی رہے گی حشر تک
پھول اپنے روک لیگی نرم شاخوں کی لچک

روح تیری جانب گردوں کرے گی جب سفر
بادلوں سے بجلیاں جھپٹیں گی تجھ کو دیکھ کر

تو پکارے گا کوئی حاکم تجھے آ کر بچائے
رعد گرجے گا کہ اب یہ بے حیا بچ کر نہ جائے

آسماں پر بھی نہ او بخت پائے گا اماں
چاٹ لینے کو تجھے دوزخ نکالے گا زباں

تیری مستورات کا بازار میں ہوگا قیام
معرضِ دشنام میں تیرا لیا جائے گا نام

کیا جوانوں کے غضب کا ذکر، او ابنِ خطاب!
سُن کے تیرا نام اُجڑ جائے گا بوڑھوں کا خضاب
فحش سمجھی جائے گی محلوں میں تیری داستاں
کانپ اُٹھیں گی ذکر سے تیرے کنواری لڑکیاں
آئے گا تاریخ کا جس وقت جنبش میں قلم
قبر تیری دے اُٹھے گی لو، جہنّم کی قسم
صفحۂ تاریخ پر کانپیں گے یوں تیرے نشاں
بن میں جیسے رات کو ابلیس کی پرچھائیاں
تاج سے تیری وفاداری کی قسمیں باربار
بھن بھناتی ہیں تیرے ہونٹوں کے گرد، او ہرزہ کار
دم گھٹا جاتا ہے میرا دور ہو اسے تیرہ دل
تیرے منھ سے جھوٹ کے آتے ہیں بھپکے متصل
تجھ سے روگرداں نہیں ہیں صرف ملّت کے زعیم
حاکمانِ وقت بھی تجھ کو سمجھتے ہیں لعئیم
تجھ سے نفرت کی کھٹک دونوں کے آب وگِل میں ہے
فرق یہ ہے اُن کے لب پر، اور ان کے دل میں ہے
بزدلی ڈالے ہوئے تاریک چہرے پر نقاب
دیر سے تیرے خمِ ابرو میں ہے گرم خطاب
تیری پلکوں سے شقاوت کا دھواں ہے آشکار
اس دھوئیں کے سائے میں ہے حبِّ ملّت کا مزار

بزدلی سے رُخ پہ بکھرائے ہوئے سازش لٹیں
تیرے ماتھے کی شکن میں لے رہی ہے کروٹیں
تیری چشمِ تنگ کی گردش میں اے ننگِ وطن
سو رہا ہے دردِ قومی دیر سے اوڑھے کفن
قوم کا دل ہے تیرے ہونٹوں کے اندر پاش پاش
دوش پر ہے تیرے لہجے کی تری غیرت کی لاش
ہو چکے ہیں مشورے تیری فنا کے واسطے
جاگ اُٹھ، اب بھی سویرا ہے خدا کے واسطے

ا؎ شعلہ و شبنم - ص ۷۵ -

کب تک[1]

رہے گی اہلِ جفا پر تری عطا کب تک
بنے رہیں گے الٰہی یہ بت خدا کب تک

لیے رہے گا دکھانے کو منہ میں گلدستے
زبوں شعار حکومت کا اژدہا کب تک

کمندِ فکر میں اُلجھا کے ہنسنے والوں کو
زبانِ علم کہے گی گرہ کُشا کب تک

کوئی بتاؤ یہ پیرانِ دامن آلودہ
بنے رہیں گے جوانانِ پارسا کب تک

کوئی بتاؤ کہ قبضے میں بادِ صرصر کے
رہے گا منصبِ دیرینۂ صبا کب تک

---

[1] شعلہ و شبنم۔ ص ۵۹۔

خریدار تو بن

اے دل آزادیٔ کامل کا سزاوار تو بن
پہلے اُس کاکلِ پیچاں کا گرفتار تو بن

یوں تو صبحِ رُخِ محبوب نہ ہو گی طالع
پہلے اے دیدۂ دل! دیدۂ بیدار تو بن

چشم بر راہ ہے شیرینیٔ صد آبِ حیات
تلخیاں جھیل کے شایانِ لبِ یار تو بن

اوّلیں شرط ہے، ہر جنگ میں احساسِ خودی
فتح خود پاؤں پہ جھک جائے گی خوددار تو بن

یوں بھڑکنے سے رہا شعلۂ عزمِ منصور
پہلے پروانۂ شمعِ رسن و دار تو بن

خود ہی چھٹ جائے گا گردوں سے سحابِ خمار
ہم نشیں! خلوتیٔ ساقیٔ سرشار تو بن

قبضۂ یار میں رہنے کو اگر ہے بیچین
عرصۂ دہر میں چلتی ہوئی تلوار تو بن

آشیاں خود سے جلا دے گی مشیت تیرا
کھیل تو آگ سے، بجلی کا خریدار تو بن

لے شعلہ و شبنم۔ ص۔ ۶۔

خریدار نہ بن[1]

چونک کبھی خواب سے اے صیدِ زبونِ اغراض
عصرِ بیتاب میں یوں نقش بہ دیوار نہ بن

عشق میں گو دلِ بیمار ہے سب کچھ لیکن
نرگسِ ارزقِ چالاک کا بیمار نہ بن

بہرِ خوشنودیٔ اغیار، یگانوں کو نہ چھیڑ
اپنے ہی سر پہ جو چلتی ہے وہ تلوار نہ بن

متحد عزم سے کر سدِ سکندر تعمیر
باہمی جنگ سے گرتی ہوئی دیوار نہ بن

چٹکیاں باغ میں سرگرم ہیں گلچینوں کی
چمنستانِ جہاں میں گلِ بے خار نہ بن

توڑ اُس جال کو جکڑے ہے جو بازو تیرے
بستۂ کشمکشِ سبحہ و زنار نہ بن

اہلِ بازار دنارت سے سروکار نہ رکھ
حامیٔ مسئلہ اندک و بسیار نہ بن

پست سے پست ہے جو چیز وہ بن جا لیکن
مر کے بھی جنسِ غلامی کا خریدار نہ بن

---

[1] شعلہ و شبنم ۔ ص ۶۱ ۔

رعبِ حکومت[1]

اک فرنگی معمر و بیمار ۔۔۔ سانس لینا بھی تھا جسے دشوار
بید کو ٹیکتا، چرٹ سلگائے ۔۔۔ اک طرف جا رہا تھا سر نہوڑائے
سامنے سے مثالِ پیلِ دماں ۔۔۔ ہند کا آ رہا تھا ایک جواں
رشکِ ارجن، نمونۂ سہراب ۔۔۔ رُخ پر امواجِ عنفوانِ شباب
دونوں آئے قریب جیسے ہی ۔۔۔ ہٹ گیا ڈر کے اک طرف ہندی

خون رو، خون، اے دلِ محروم
دیکھ لے فرقِ حاکم و محکوم!

---

[1] شعلہ و شبنم ۔ ص ۶۳ ۔

زندہ مُردے[1]

کیا کہوں اہلِ ہند کی حالت

ایک عالم ہے "دن" اگر تو یہ "رات"

خواہ کچھ ہو اثر نہیں لیتے

اس طرح مٹ چکے ہیں احساسات

یا تو یہ "سائے" ہیں "بہ شکلِ بشر"

یا یہ "مُردے" ہیں کچھ "بہ قیدِ حیات"

---

[1] شعلہ و شبنم - ص ۶۲ -

ناخدا کہاں ہے؟

خبر لو آسودگانِ ساحل! کہ سامنے مرگِ ناگہاں ہے
چھڑی ہوئی دیر سے لڑائی زبوں عناصر کے درمیاں ہے
تمام دنیا غرق غرق ہے، تمام ہستی رواں دواں ہے
حقیر تنکے کی طرح کشتی کبھی یہاں ہے، کبھی وہاں ہے
کوئی خدا کے لیے بتاؤ کہ ناخدا کون ہے کہاں ہے؟

غضب کے گرداب پڑ رہے ہیں، عظیم طوفان زور پر ہے
بلا کی پُروائی چل رہی ہے، جلال میں روحِ بحر و بر ہے
تھپیڑے کھاتا ہوا سفینہ، کبھی اِدھر ہے، کبھی اُدھر ہے
ہوا اُٹھائے ہوئے ہے طوفاں، گھٹا نکالے ہوئے زباں ہے
کوئی خدا کے لیے بتاؤ کہ ناخدا کون ہے کہاں ہے؟

ہواؤں کی سنسناہٹیں ہیں، سیاہ موجوں کے ہیں تھپیڑے
ہر اک بھنور میں ہے وہ تلاطم کہ غرق کر دے ہزار بیڑے
بلا ہیں سیلاب کے طمانچے، غضب ہیں طوفان کے دڑیڑے
کڑک کی زیرِ نگیں زمیں ہے، گرج کے قبضے میں آسماں ہے
کوئی خدا کے لیے بتاؤ کہ ناخدا کون ہے کہاں ہے؟

بھرا ہوا غیظ میں، سمندر فضا کی جانب ہمک رہا ہے
گرج [illegible] کڑک چمک [illegible] بھڑک ہوا ہے، ہوا گھٹا ہے

جھنن جھنن ہے، گھڑڑ گھڑڑ ہے، گھنن گھنن ہے، دنا دنا ہے
فلک کے ہونٹوں پر الحذر ہے، زمیں کے لب پر الاماں ہے
کوئی خدا کے لیے بتاؤ کہ ناخدا کون ہے کہاں ہے؟
ڈراؤنی رات رو رہی ہے، بھرے ہوئے ہیں تمام جل تھل
بھنور نکالے ہوئے ہیں آنکھیں، جھکے ہوئے ہیں سیاہ بادل
ہوا میں شورش، گھٹا میں غوغا، فضا میں لرزش، زمیں پہ ہل چل
تمام گیتی ہے پارہ پارہ، تمام گردوں دھواں دھواں ہے
کوئی خدا کے لیے بتاؤ کہ ناخدا کون ہے کہاں ہے؟
سلام لو اے عزیز یارو! کہ اب نہیں شکل زندگانی
کہا سنا سب معاف کر دو، بھلا دو باتیں نئی پرانی
بڑھو کہ وہ جھک پڑا سفینہ، اٹھو کہ آنے لگا وہ پانی
مبارک اے جنگِ کفر و ایماں! حیات دم بھر کی میہماں ہے
کوئی خدا کے لیے بتاؤ کہ ناخدا کون ہے کہاں ہے؟

لہ شعلہ و شبنم - ص ۶۵ -

ضعیفہ[1]

اک ضعیفہ راستے میں سو رہی ہے خاک پر
مردنی چھائی ہوئی ہے چہرۂ غمناک پر
اور کس موسم میں، جب طاعون ہے پھیلا ہوا
ذرہ ذرہ ہے وبا کے خوف سے سمٹا ہوا
رات آدھی آ چکی ہے بام و در خاموش ہیں
اہلِ دولت لیلیٰ عشرت سے ہم آغوش ہیں
اس قیامت کی ہے طاری ظلمتِ ہول آفریں
شب کے دل میں صبح کا گویا تصور تک نہیں
پیچھے پیچھے آ رہا ہے کون؟ یہ کیا بات ہے
بج رہے ہیں کان اُف کیسی بھیانک رات ہے
حلقۂ ظلمت میں ہے راہوں کی سہمی روشنی
یا چمکتی ہیں گھنی جھاڑی سے آنکھیں شیر کی
لرزہ بر اندام ہے صحنِ زمیں کا عرض و طول
ہو رہا ہے خاک پر ناپاک روحوں کا نزول
آ رہی ہیں آسماں سے یہ صدائیں دم بدم
دیکھ اسبابِ ہلاکت پر نہ پڑ جائے قدم
بام و در پر موت کا پرچم ہے لہرایا ہوا
آ رہی ہے ہر قدم پر بوئے انفاسِ وبا

رونگٹے سارے کھڑے ہیں، سانس لینا ہے وبال
الاماں شورِ سگانِ راہ و غوغائے شغال
اُف لرزتی خوفناک آواز چوکیدار کی
نبض چھوٹی جا رہی ہے گنبدِ دوار کی
چپکے چپکے سانس لینے سے گھٹا جاتا ہے دم
رکھ رہا ہوں بولتے ذرّوں پہ رک رک کر قدم
عبرت و دہشت کا خنجر ہے دلِ غمناک پر
ہائے یہ بے دم پڑا ہے کون ٹھنڈی خاک پر
آہ اے بے کس ضعیفہ! غم کی تڑپائی ہوئی
اے زمانے کی جھنجھوڑی، زر کی ٹھکرائی ہوئی
میرے دل کے آئینے کو کر رہا ہے چور چور
تیرے سر پر رہگزر کی شمع کا ہلکا سا نور
یہ ترے سر کی سفیدی اور یہ گردِ ضلال
ہم تو کیا، شرما رہا ہے خود خدائے ذوالجلال
بھوک کے لشکر کا ہے رُخ پر ترے گرد و غبار
عہدِ رزاقی کے ماتھے پر عرق ہے آشکار
آہ رے دکھیا، یہ کیسی پائمالی ہو گئی
ٹھوکریں کھانے کو تیری گود خالی ہو گئی
سو رہا ہے تیرا وارث کس طرف پہنے کفن؟
دفن ہے کس دیس میں تیرا وہ سی بانکپن؟

بزمِ عشرت میں دلہن کس نے بنایا تھا تجھے؟
بیاہ کر کون اپنے گھر میں آہ لایا تھا تجھے
خونِ رُخ پر دوڑتا ہوگا تری آواز سے
تجھ کو پالا ہوگا تیری ماں نے کس کس ناز سے
ڈالتی ہوگی تجھے نہلا دُھلا کر سر میں تیل
باپ کا دل کھینچتا ہوگا، تری گڑیوں کا کھیل
یاس کی تاثیر کیوں چہرے پہ دونی ہوگئی
مائیکا ویران ہوا، سسرال سونی ہوگئی
چاہنے والے ترے سب تربتوں میں سو گئے
کھیلتی تھی جن گھنے باغوں میں وہ کیا ہوگئے
اف ری مایوسی کسی کا آسرا رکھتی نہیں
شبہ ہوتا ہے کہ تو شاید خدا رکھتی نہیں

تو کہاں کی رہنے والی ہے ترا کیا نام ہے
بول تو کس دل نشیں آغاز کا انجام ہے

ہند میں انسانیت کا درد ہی باقی نہیں
درد ہو کس طرح کوئی مرد ہی باقی نہیں
مرد ہی ہوتے تو کرتے بے کسوں کا احترام
مرد ہی ہوتے تو رہ سکتے تھے یوں بن کر غلام

خدمتِ اغیار سے فرصت کوئی پاتا نہیں
سچ ہے اپنوں پر غلاموں کو ترس آتا نہیں

اے ضعیف! ننگ ہے تو ملک و ملت کے لیے
تو ہے اک دھبّہ جبینِ اہلِ دولت کے لیے
اک کھلی ذلّت ہے ادیان و ملل کے واسطے
طوق ہے لعنت کا تو اہلِ دول کے واسطے
تو وعیدِ قہر ہے اربابِ عشرت کے لیے
برص کا اک داغ ہے روئے حکومت کے لیے
مجھ کو حیرت ہے کہ تجھ کو دیکھ کر زار و نزار
گڑ نہیں جاتے حیا سے حاکمانِ ذی وقار
دیکھ کر تیرا ڈھلا منہ کا نہیں ہوتا ہے چور
گردنوں کے خم کو سختی بخشنے والا غرور
پڑ نہیں جاتے الٰہی سینۂ دولت میں داغ
بجھ نہیں جاتے شبستانِ امارت کے چراغ
اپنی تابِ زر سے اے سرمایہ دارو! ہوشیار
اپنے تاجوں کی چمک سے تاجدارو! ہوشیار
نیلم و یاقوت سے شعلے بھڑک اٹھنے کو ہیں
سرخ دیناروں میں انگارے دہک اٹھنے کو ہیں
فرشِ گل والو! زمیں پر لوگ محوِ خواب ہیں
خرمنوں کے پاسبانو! بجلیاں بیتاب ہیں!!

۱؎ شعلہ و شبنم۔ ص ۶۸۔

بوالعجبی

کل منھ اندھیرے صبح کو تالاب کے قریب
یاد آرہا تھا دل کو خیمِ کاکلِ حبیب

مس ہو رہی تھی قلب و جگر سے خنک نسیم
بوجھل سی تھی ترائی کی بھیگی ہوئی شمیم

جھونکے تھے اضطراب کا پہلو لیے ہوئے
مرطوب و نرم دوب کی خوشبو لیے ہوئے

تھی مد و جزرِ آب کے اندر چھڑی ہوئی
ٹھنڈی ہوا کے تند تھپیڑوں کی راگنی

افسانہ کہہ رہا تھا شبِ تارِ ہجر کا
نظروں سے اس طرف کا کنارا چھپا ہوا

دھندلی بلندیوں پہ گھٹاؤں کا تھا دھواں
گردوں سے آرہی تھیں دبے پاؤں بوندیاں

چھایا ہوا تھا صبح کے ماتھے پہ رنگِ شام
اتنے میں اک کسان نے جھک کر کیا سلام

جاگے ہوئے لطیف خیالات سو گئے
کانپی نگاہ رونگٹے سب جھن سے ہو گئے

مزدور اور رخشندہ دلوں کو کرے سلام!
شاہ، اور گدائے راہ نشیں کو کہے امام!!

قوت کا اور ضعف کے در پر سرِ نیاز
صحت اُٹھائے اونگھتی بیماریوں کے ناز
اونچی زمیں کے سامنے چرخِ بریں جھکے
فاقے کے آستاں پہ غذا کی جبیں جھکے
بیچارگی کے ساتھ جھکائے کریم سر
مغرور بھیک مانگنے والوں کو دیکھ کر
پودوں کے ڈر سے مالکِ گلشن ہو بیقرار
پھولوں کو اور سجدے کرے خالقِ بہار
در کھٹکھٹائے شاہ، گدائے حقیر کا
فولاد اور مان لے لوہا حریر کا
عقلِ سیاہ کار کی عزت کرے جنوں
قدموں پہ بزدلی کے ہو تلوار سرنگوں
ناطاقتی ہو کشورِ طاقت میں شہریار
ریشے کو اور برق بنائے سپاہدار
مردانِ کوہ دشت و دلیرانِ تندخو
عاجز ہوں دخترانِ تمدن کے روبرو
بارِ خدا! "یقین" ہو قرباں "گمان" پر
لعنت ہو اس زمین پہ، تف آسماں پر

لہ شعلۂ شبنم ۔ ص ۱۷ ۔

پیرزن[۱]

اک مشن اسکول کی لیڈی بصد انداز و ناز
دختران ہند سے ہے دیکھ سرگرم نیاز
پھر رہی ہے لڑکیوں کی صف میں بل کھاتی ہوئی
ہاتھ میں کنگھی لیے زلفوں کو سلجھاتی ہوئی
کچھ خبر بھی ہے تجھے نا واقف لیل و نہار
یعنی اس تزئین گیسو میں ہے کتنا خلفشار
کنگھیاں کی جا رہی ہیں کاکل شبگیر میں
پیچ ڈالے جا رہے ہیں ہند کی تقدیر میں
واں سلجھتے جا رہے ہیں گیسوئے عنبر شکن
یاں اُلجھتا جا رہا ہے عقدۂ اہل وطن
کام سے جس وقت یہ مشّاطہ فرصت پائے گی
ہندیوں کے ہر بُن مو سے لہو ٹپکائے گی
اس کا جوڑا ایک بانبی، اس کی کنگھی ایک چال
ناگ، کالے ناگ سے بدتر ہے اس کا بال بال
اس کے ہاتھوں گندھ رہی ہیں جس قدر بھی چوٹیاں
ناگنیں بن جائیں گی اک دن پئے ہندوستاں
لہر کھا کر پھانس سینوں میں چبھو جائیں گے کل
بال یہ زنجیر ہائے قوم ہو جائیں گے کل

مادرانِ دورِ مستقبل نہ ہو جائیں شکار
اِس مشن اسکول کی ڈائن سے یارو ہوشیار

باد طوفانی ۔ رائے سرد بن کر آئی ہے
پیر زن فرہاد کی ہمدرد بن کر آئی ہے

لہ شعلہ و شبنم ۔ ص ۷۲۔

حیف اے ہندوستاں

غیر کی خدمت گزاری، باہمی خونریزیاں
دوپہر کی دھوپ سر پر اور رہ خوابِ گراں
حیف اے ہندوستاں، صد حیف اے ہندوستان

بے زروں کی ڈوبتی آنکھوں میں فاقوں کے نقوش
اہلِ دولت کی جبینوں پر شقاوت کے نشاں
حیف اے ہندوستاں، صد حیف اے ہندوستان

قائدانِ قوم و مکروہاتِ حبِّ مال و زر
شاعرانِ ملک و مفروضاتِ سودائے بتاں
حیف اے ہندوستاں، صد حیف اے ہندوستان

گوسفندوں کی عبادت میں ہو شیروں کی کچھار
بوم کے زیرِ نگیں شہباز کا ہو آشیاں
حیف اے ہندوستاں، صد حیف اے ہندوستان

ابر بن بن کر برستی ہیں، خبر بھی ہے تجھے؟
گلشنِ اعدا پہ تیری باہمی خونریزیاں
حیف اے ہندوستاں، صد حیف اے ہندوستان

عورتیں تک دشمنوں کی موت سے ڈرتی نہیں
آہ اے بیگانۂ ذوقِ حیاتِ جاوداں
حیف اے ہندوستاں، صد حیف اے ہندوستان

رعبِ تیموری! کہاں جا کر کروں تجھکو تلاش؟
عزمِ گردانِ مہابھارت تجھے ڈھونڈھوں کہاں؟
حیف اے ہندوستاں صد حیف اے ہندوستان

لہ شعلہ و شبنم - ص ۴۷ -

بھوکا ہندوستان

ایک مفلس کے مکاں میں کل ہوا میرا گذر
خاک پر بیٹھا تھا بچہ، اور بیوی تخت پر
تخت اینٹوں کی کمی بیشی سے ناہموار تھا
وزن اک نازک سی عورت کا بھی جس پر بار تھا
تیرہ قسمت گھر کا مالک پائمالِ صد جنوں
بوریئے پر اک طرف بیٹھا ہوا تھا سرنگوں
سرد پیشانی پہ تھا چھایا ہوا دل کا دھواں
جس میں غلطاں تھیں شرافت کی سبک چنگاریاں
اس کی ہستی فقر سے تھی اس قدر نامعتبر
مارتے تھے قہقہے جہالِ جس کے علم پر
تھا وہ یوں افلاس کے ہاتھوں گرفتارِ قلق
ہر سبک سر کو تھا جس پر معترض ہونے کا حق
تھا وہ اُس منزل میں جب رہتی نہیں چہرے پر آپ
مانتا ہے شیب کے دعوے جب انساں کا شباب
فاقہ کش انسان جب ہوتا ہے یوں زیروزبر
جھینپتا ہے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھ کر
جب سبک ہوتا ہے اس درجہ محبت کا نیاز
خود شریکِ زندگی بھی ترک کر دیتی ہے ناز

جب کوئی عزت سے پیش آتا ہے تو مردِ حزیں
سوچنے لگتا ہے یہ مجکو بناتا تو نہیں
زندگی جس وقت ہو جاتی ہے اتنی پائمال
وہم بن جاتا ہے خود اپنی شرافت کا خیال
دل میں جب احساسِ رحمت کا نہیں بہتا ہو دم
کفر کی سرحد پہ جب انساں کے پڑتے ہیں قدم
جب زبوں و خستہ جاں انسان کا ذوقِ وفا
خلق کی نظروں میں بنتا ہے مدد کی التجا
زندگی ہوتی ہے جب اس درجہ عبرت آفریں
تخلیے کا دوست بھی موقع کبھی دیتے نہیں
جب نظر آتے معلوم ہوتے ہیں خود اپنے ہی گھر
وہم ہوتا ہے رکاکت کا خود اپنی وضع پر
رُخ پہ جب ہوتے ہیں ایسی خستہ حالی کے نشاں
جس کے "سچ" پر "جھوٹ" کا ہوتا ہو دنیا کو گماں
اُس مصیبت سے تھی اس کی زندگی زیر و زبر
جس مصیبت میں شرافت تولنے لگتی ہے پر
اُس کے سر پر تھا تہیدستی کا وہ بارِ گراں
بولنے لگتی ہیں جس سے زندگی کی ہڈیاں
مفلسی کے اس کنارے پر تھا وہ گرمِ خرام
ترک کر دیتا ہے بیٹا باپ کا جب احترام

الغرض چھائی ہوئی تھی یاس سقف و بام پر
روح تھرانے لگی میری یہ منظر دیکھ کر

گھر تھا یا اک کارواں کھویا ہوا بھٹکا ہوا
خفتہ تھی قسمت مکینوں کی، مکاں سویا ہوا

یہ مکاں اک قصرِ عالی کا تھا ایک ایسا مقام
تھا جہاں کل اُس کے آبا کے غلاموں کا قیام

جس طرف اس کا لڑکپن بھول کر جاتا نہ تھا
عہدِ طفلی میں جدھر یہ کھیلنے پاتا نہ تھا

جو مکاں کل نغمۂ خدام سے پُرجوش تھا
آج آقا کو لیے آغوش میں خاموش تھا

پوچھتا جاتا تھا لیکن "خیر سے تو ہیں مکیں"
مجھ میں اک مدت سے کوئی قہقہہ گونجا نہیں

طاق پر رکھا ہوا تھا ایک سویا سا چراغ
طاق کے نیچے تھے کڑوے تیل کے دو ایک داغ

تیل بہنے کا نشاں دیوار پر اصلا نہ تھا
ایک دن بھی وہ دیا شاید کبھی چھلکا نہ تھا

اس حقیقت کو سمجھ سکتے نہیں اہلِ فراغ
اور ظلمت کو بڑھا دیتا ہے مفلس کا چراغ

سرد چولہے کے قریب اُڑتا ہوا پھیکا غبار
الگنی پر چند کپڑے اور وہ بھی تار تار

جا بجا سے پپڑیاں دیوار کی چھوڑی ہوئی
دھجیاں گنتی کی تھیں اُن میں بھی کچھ ٹوٹی ہوئی
ایک گوشے میں تھا بستر کے عوض تھوڑا پیال
جس پہ دو ٹکڑے دری کے اور اک صد پارہ شال
شال کے ہر تار میں خوابیدہ سو نقش و نگار
عہدِ ماضی کی یہی لے دے کے تھی اک یادگار
بچہ بہلا سا ہوا تھا خاک کے اک ڈھیر سے
ماں دوپٹہ سی رہی تھی سر جھکائے دیر سے
کھیلنے میں طفلکِ گل فام تھا ڈوبا ہوا
آئی اتنے میں گلی سے آم والے کی صدا
کانپتی آئی صدا ہلنے لگا بچے کا دل
سانس لی یوں جیسے رکھی ہو کوئی چھاتی پہ سل
ہو گئی اگلی ضدوں کی یاد سے دنیا سیاہ
ماں کے چہرے کی طرف ڈالی جھجکتی سی نگاہ
ماں کی نظریں اُٹھ گئیں، اُٹھ کر پھریں پھر کر جھکیں
"ہائے میرے لال! میرے پاس تو کچھ بھی نہیں"
دیکھ کر ماں کی اُداسی ہو گئی پامال یاس
انکھڑیوں میں آم کی سرخی تخیّل میں مٹھاس
ہونٹ کانپے خود بہ خود او رہ گئے پھر کانپ کے
دل میں پھر چبھنے لگے اگلی ضدوں کے تجربے

راستے میں آ گئی دیوار نالے چڑھ گئے
منھ میں تھرائی زباں الفاظ آگے بڑھ گئے

چھا گیا چہرے پہ سناٹا دلِ ناکام کا
"اشک" بن کر آنکھ سے ٹپکا "تصور" آم کا

چہرہ مرجھایا نفس بوجھل سا کچھ ہونے لگا
دل کے سناٹے میں بچپن کھو گیا، سونے لگا

نیم جاں ماں باپ کی نظروں کے خط ملنے لگے
باپ کا سر اور دکھیا ماں کے لب ہلنے لگے!!

آہ اے ہندوستاں ! اے مفلسوں کی سرزمیں
اس کرے پر کوئی تیرا پوچھنے والا نہیں

آہ اک دل بھی ترے افلاس پر ہلتا نہیں
اب تو اک روٹی کا ٹکڑا بھی تجھے ملتا نہیں

ہندو و مسلم نہیں اٹھتے تری امداد پر
تف ہے ایسی بے حمیّت ناخلف اولاد پر

ہائے کیا کرنا تھا ان کو اور کیا کرتے ہیں یہ
گائے اور باجے پہ لڑنے کے لیے مرتے ہیں یہ

اس طرف ہے خوبیٔ قسمت سے باجا اور گائے
اُس طرف افلاس کے مارے ہوؤں کی ہائے ہائے

ناخلف بچے تری جانب نظر کرتے نہیں
ان کو جس میداں میں مرنا چاہیے مرتے نہیں

سخت ہو جاتی ہے اس سے ہر کڑی زنجیر کی
مار کر اپنوں کو مرنا موت ہے خنزیر کی
ان سے کہہ دے "کجا بربادیاں؟ آباد ہو
یا گلے خود کاٹ کر مر جاؤ، یا آزاد ہو
آہ اے ہندوستاں! اے کشورِ زار و نزار
تیرے بچے بھی بلکتے ہیں، جواں بھی بیقرار
تیرے مردوں کا کفن تک لے گئے چالاک چور
شق ہو اے تاریک جیتے جاگتے مُردوں کی گور
تیرے اوپر آکے ٹھہرا ہے ٹھگوں کا قافلا
جھوم کر، بیٹھ، اے بھیانک دیو! پیٹ اپنی بلا
اے بھڑکتی آگ ٹھنڈی راکھ کی تہ سے نکل
اے رگِ غیرت ابھر، اے خوں کے چشمے اُبل
گردنیں طوقِ غلامی سے ہوئی جاتی ہیں کج
اے کڑکتی برق گر، اے جھومتے بادل گرج
تا کجا یہ خواب؟ اے ہندوستاں! آ ہوش میں
آج بھی ہیں سیکڑوں ارجن ترے آغوش میں
آ رہی ہے کب سے رہ رہ کر صدائے انقلاب
زندہ ہے تو اے وطن، دیتا نہیں پھر کیوں جواب؟

زندہ ہے تو میری ہمت کو پرِ پرواز دے
وہم ہوتا ہے مجھے، آواز دے، آواز دے!!

یہ اجل کی بے حسی ہے، یا فقط خوابِ گراں؟
بول اے ہندوستاں! ہندوستاں!! ہندوستاں!!!

لہ شعلہ و شبنم ۔ ص ۷۰۔

بہتے ہوئے خون کی برادری

مژدہ باد اے ایشیا! اے سرزمین زرفشاں
آ گئی وہ ساعتِ بیداریٔ ہندوستاں
مژدہ باد اے سرزمین ہند! اے جنّتِ سواد
میاں سے باہر نکلنے ہی پہ ہے تیغِ فساد
سُرخ پرچم کھولنے پر ہے شقاوت کا جنوں
تیرے ذرّوں پر بہے گا ہندو و مسلم کا خوں
لیکن اس سے تو ہراساں ہو نہ اے ارضِ مراد
خون کا سیلاب دھو دیتا ہے ہر بغض و عناد
رشتہ کٹ جاتا ہے بہتے خون سے اوہام کا
خانہ جنگی غسلِ صحت ہے علیل اقوام کا
یاد رکھو جذبۂ غیرت میں جوش آجائے گا
خون بہا تو ہندو و مسلم کو ہوش آجائے گا
غنچۂ اُمیدِ اربابِ وطن کھل جائے گا
خاک پر بہتے ہی دونوں کا لہو مل جائے گا

لہ شعلہ - ص ۸۰ -

پیاسی ندّی

اے برادر! پل پہ جب گنگا کے آجاتی ہے ریل
پھینکتا ہے کس لیے سکّے، یہ کیا کرتا ہے کھیل؟
قوم کی آنکھوں سے جاری ہیں لہو کی ندّیاں
ڈوبنے ہی پر ہے جن میں غیرتِ ہندوستاں
کیوں نہیں کرتا ہے تو اس خون کی ندّی کا پاس
جس کو گنگا سے کہیں بڑھ چڑھ کے ہے سکّوں کی پیاس
ڈوب کر گنگا میں اک پیسہ اُبھر سکتا نہیں
ہند کی آنکھوں کے آنسو خشک کر سکتا نہیں
کار آمد ہے جو آبِ زندگانی کی طرح
تو بہا دیتا ہے اُس دولت کو پانی کی طرح
دیکھ کر تیری یہ نادانی یہ کارِ ناصواب
شرم کے مارے ہوئی جاتی ہے گنگا آب آب
بازوئے زر! ناخدائی کے لیے تیار ہو
ڈوبنے والی ہے کشتی قوم کی ہشیار ہو
کی گئی ناوقت قربانی تو پھر کیا فائدہ
سر سے اونچا ہو گیا پانی تو پھر کیا فائدہ

لے شعلہ و شبنم - ص ۸۱ -

بادشاہ کی سواری

پرے جمائے ادب سے کھڑے ہوئے ہیں سوار
سڑک پہ رعب ہے جنبش میں ہیں در و دیوار
چلے تو کیسے چلے مجلسِ کوچہ و بازار
اُبل رہا ہے تحکم، برس رہا ہے وقار
زمیں پہ چرخ سے تنویر ماہ آتی ہے
ہٹو، بچو کہ سواریٔ شاہ آتی ہے

سڑک ہے بند، پڑا ہے رکا ہوا ہر کام
نہ جانے کتنے گھروں میں مچا ہے اک کہرام
ہٹا رہے ہیں غریبوں کو سلطنت کے غلام
برس رہے ہیں جو کوڑے تو گر رہے ہیں عوام
سواریٔ شہ گردوں وقار آتی ہے
نویدِ رحمتِ پروردگار آتی ہے

"ارے یہ موڑ پہ تیورا کے کون شخص گرا؟"
"حضور، ساٹھ برس کی مریض اک بڑھیا"
"اسے ہٹاؤ، یہاں سے یہ ہے شگون بُرا"
لبوں پہ جان ہے چلتا ہے سانس کا ڈورا
اسے ہٹاؤ کہ اس کا اثر بُرا ہوگا
جبینِ شاہ پہ بل پڑ گئے تو کیا ہوگا

"سفید ہو گئیں آنکھیں، اکڑ چلا ہے بدن"
"گلے میں سانس ہے، ڈھلنے ہی پر ہے اب گردن"
"حلال خور ہے کیا اپنی جان کا دشمن"
"اسے گھسیٹ کے گھورے پہ ڈال دے فوراً"
"جہاں پناہ غضب ناک ہو نہ جائیں کہیں"
"نگاہیں شاہ کی ناپاک ہو نہ جائیں کہیں"

بگل بجا، وہ سواریٔ شہر یار آئی
خزاں کی رات گئی صبحِ نو بہار آئی
خدا کا شکر کہ پھر بادِ مشکبار آئی
"ادب کے ساتھ" کی آواز بار بار آئی
فلک نے جان لیا اور زمین مان گئی
کسی کی آئی سواری، کسی کی جان گئی

لہ شعلہ و شبنم – ص ۸۳ –

سجّاد سے

اگر پدر نتواند، پسر تمام کند

اے میری آنکھوں کے تارے اے مرے لختِ جگر
ہنس کھیل تیرے واسطے ہے فردوس آغوشِ پدر
لیکن اے نورِ نظر یہ دور مٹ جانے کو ہے
زندگی میں ایک دورِ تلخ بھی آنے کو ہے
یہ زمانہ طور سے بے طور ہو جائے گا کل
یہ زمیں، یہ آسماں، کچھ اور ہو جائے گا کل
اس ورق کو جب اُلٹ دے گی ہوائے انقلاب
مجھ پہ یعنی بند ہو جائے گا جب ہستی کا باب
میرے مرتے ہی چلے گی وہ قیامت کی ہوا
پھیر لیں گے تجھ سے منھ ظالم عزیز و اقربأ
گو خدا کا شکر ہے بھائی کوئی تیرا نہیں
تجکو "مادر زاد" دشمن کا کوئی کھٹکا نہیں
پھر بھی خونی اقربا کے صید ہوتے ہیں یتیم
بیکسوں کی آہ ہے اُن کے لیے موجِ نسیم
لطف کے پردے میں کرتے ہیں یگانے پائمال
مہر کی نظریں، یتیموں کے لیے بُنتی ہیں جال

جو چھڑکتے ہیں پسینے پر ترے خونِ جگر
کل پسینہ بھی نہ ٹپکائیں گے تیرے خون پر

باپ کے مرتے ہی ہو جاتی ہے دنیا خشمگیں
اس تلاطم میں زمیں برسوں جگہ دیتی نہیں

ہو چکا ہے اقربا کے ہاتھ سے پامال دیکھ
دور کیوں جاتا ہے اپنے باپ ہی کا حال دیکھ

دیکھ کیونکر میرے دل کو پارہ پارہ کر دیا
مہر کو کچھ اس طرح توڑا کہ تارا کر دیا

لیکن اس ہلچل میں ہو جاتا ہے جس سے جی نڈھال
عزتِ دیرینۂ اجداد کا رکھنا خیال

ہر نفس تیار رہنا ہر بلا کے واسطے
دین و قلم بننا خدا کے واسطے

"ضعف" ہے روزِ ازل سے تیرہ بختی کا شکار
زورِ علم و قوتِ بازو ہے شانِ کردگار

دل ہے تسخیرِ قوائے بحر و بر کے واسطے
ناتوانی کفر ہے نوعِ بشر کے واسطے

قبر میں روحِ پدر کو شاد کرنے کے لیے
سر کٹانا ہند کو آزاد کرنے کے لیے

ہاں تو میں تجھ سے یہ کہتا تھا کہ اے جانِ پدر
جب مرا ہو جائے گا اس دارِ فانی سے سفر

رونے والوں کو میرے مرنے پر آجائے گا صبر
شہر سے باہر کسی گوشے میں ہوگی میری قبر
محو ہو جائے گی دل سے کلفتِ مرگِ پدر
وقت کے مرہم سے بھر جائے گا یہ زخمِ جگر
ہوں، جو ہوں گے دل نشیں منظر، ترانے بے بدل
ثبت ہوگی میری چشم و گوش پر مہرِ اجل
ہونگی طالع کس قدر صبحیں بر افگندہ نقاب
میں نہ دیکھوں گا مگر تا حشر بیداری کا خواب
چاند اوجِ آسماں سے نور جب برسائے گا
ساحلِ گل ریز پر مجکو نہ لیکن پائے گا
بدلیاں برسات کی کیا کیا نہ ہونگی بیقرار
میرے اُجڑے باغ میں لیکن نہ آئے گی بہار
جائے گا آوازہ میری شاعری کا دور دور
خاک کے پتھر سے ہوگا نطق میرا چور چور
یوں تو آنا ہے نہ اس دل میں تلاطم آئے گا
قبر پر تو آئے تو لب پر تبسّم آئے گا
لیکن اے جانِ پدر، دنیا ہے وہ مضبوط جال
آدمی کا جس کے پھندوں سے نکلنا ہے محال
تو نئے ماحول میں اُس وقت ہوگا غالباً
اور نئے احباب سے معمور ہوگی انجمن

ہو سکے گی یاد میں میری نہ بھولے سے مخل
کارِ ہستی میں ترا اس طرح لگ جائے گا دل
عہدِ پارینہ کو انساں وقت دے سکتا نہیں
آدمی اس کشمکش میں سانس لے سکتا نہیں
پھر بھی اُس طوفان میں اے جوشؔ کی روحِ رواں
مادر و خواہر کی خدمت کو سمجھنا حرزِ جاں
اور اس کے بعد اے جانِ تمنائے پدر!
چند لمحوں کی بھی فرصت دے تجھے دنیا اگر
باپ کی سوئی ہوئی قسمت جگانے کے لیے
قبر پر دو پھول لے آنا چڑھانے کے لیے
باغِ ہستی کے نہ وہ باغِ جناں کے پھول ہوں
مژدۂ آزادیٔ ہندوستاں کے پھول ہوں

لہ شعلہ و شبنم ۔ ص ۸۴ ۔

انتباہ[1]

ڈرو اس وقت سے اے دشمنانِ امن و آسائش
بنا لیں جب حکم خوں ریز تلواروں کو ہم اپنی
کہ ان کا فیصلہ کچھ اس قدر دو ٹوک ہوتا ہے
کہ دو ٹکڑوں میں ذرہ بھر کمی بیشی نہیں ہوتی

(ماخوذ از عربی شاعری)

---

[1] شعلہ و شبنم۔ ص ۸۸۔

دھمکی

توُنے شاعرِ ہے۔ اے غاصب حکومت، کیا کہا؟
"تو نہ مانے گا مجھے، تو قتل کر دوں گی تجھے"
قتل سے ڈر جاؤں گا اتنا سمجھتی ہے ذلیل
جا، اور ایسی سوقیانہ قسم کی دھمکی نہ دے

لہ شعلہ و شبنم - ص ۸۹ -

مردِ انقلاب کی آواز

اگر انساں ہوں، دنیا کو حیراں کر کے چھوڑوں گا
میں ہر ناچیز ذرّے کو گلستاں کر کے چھوڑوں گا
تری اس زلف کی سوگند، اے لیلائے رنگینی
کہ ارض خار و خس کو سنبلستاں کر کے چھوڑوں گا
وہ پنہاں قوتیں جو مل کے زک دیتی ہیں دنیا کو
انھیں آپس ہی میں دست و گریباں کر کے چھوڑوں گا
سرِ تقلید کو، مغزِ تفکر سے جلا دے کر
چراغِ مردہ کو مہرِ درخشاں کر کے چھوڑوں گا
شعارِ تازہ کو بخشوں گا آب و رنگِ جمعیت
رسومِ کہنہ کی محفل کو ویراں کر کے چھوڑوں گا
چراغِ اجتہادِ نو بہ نو کی جلوہ ریزی سے
سرِ راہِ خرد مندی چراغاں کر کے چھوڑوں گا
مسلط ہیں ازل کے روز سے جو ابنِ آدم پر
میں اُن اوہام کو سر در گریباں کر کے چھوڑوں گا
ترے اس پیچ و خم کھاتے دھویں کو شمع حق بینی
فرازِ عقل پر ابرِ خراماں کر کے چھوڑوں گا
جو انساں آج سنگ و خشت کو معبود کہتا ہے
اُس انساں کو الوہیت بداماں کر کے چھوڑوں گا

قناعت جس نے کر لی ہے عناصر کی غلامی پر
میں اس کو گردگارِ بادو باراں کر کے چھوڑوں گا

قسم کھاتا ہوں اے کوہِ علم! دستِ زلیخا کی
کہ داماں کو ترے یوسف کا داماں کر کے چھوڑوں گا

پکاروں گا کلیمِ نو کو طورِ عصرِ حاضر سے
جو کچھ کہہ دوں گا اُس کو دین و ایماں کر کے چھوڑوں گا

مری حکمت بشر کو دعوتِ نو دے کے دم لیگی
میں اس بھٹکے ہوئے انساں کو انساں کر کے چھوڑوں گا

اگر یہ کفر ہے جو کچھ زباں پر میری جاری ہے
تو میں اس کفر کو گلبانگِ عرفاں کر کے چھوڑوں گا

اگر عصیاں ہی پر موقوف ہے انساں کی بیداری
تو میں دنیا کو غرقِ بحرِ عصیاں کر کے چھوڑوں گا

---

[1] شعلہ و شبنم ۔ ص ۹۱۔

شاعرِ ہندوستان[1]

زندہ مردوں کی ہے بستی کون سنتا ہے یہاں
تا بہ کے چیخا کروں، ہندوستاں، ہندوستاں
اک نظر بھی قدر دانِ جوہرِ قابل نہیں
ہند کے اُجڑے ہوئے سینے کے اندر دل نہیں
آئیں یوسف بھی اگر لپٹے ہوئے بازار میں
ایک گاہک بھی نہ پائیں ہند کے بازار میں
سچ کہا ہے جزو میں اندازِ کل ہوتا نہیں
اس چمن کی بلبلوں کو عشقِ گلُ ہوتا نہیں
ہند ہے وہ گل کہ جس میں کشمکش سے دھو کے ہات
سو رہی ہے موت کے زانو پہ لیلائے حیات
وہ جماعت شرم سے نام اپنا لے سکتی نہیں
ایڈریس[2] سی چیز جو شاعر کو دے سکتی نہیں
آہ اے "ٹیگور" تو کیوں ہند میں پیدا ہوا؟
سچ بتا تو کس ادائے ملک پر شیدا ہوا؟
اس جگہ تو کانپتی ہیں قہر کی پرچھائیاں
زندگی غائب ہے مُردے سانس لیتے ہیں یہاں
شعر کو بہروں میں ممکن ہی نہیں حُسنِ قبول
شاعرِ ہندوستاں ہے اصل میں جنگل کا پھول

جس کے گرد و پیش رہتا ہے بہایم کا ہجوم
روندتے ہیں جس کو چوپائے، جھلستی ہے سموم

جہل کا دریا ہے اور ناقدریوں کی لہر ہے
شاعرِ ہندوستاں ہونا خدا کا قہر ہے

ا؎ شعلہ و شبنم۔ ص ۹۴۔
۲؎ دہلی میونسپلٹی نے ٹیگور کو ایڈریس دینے سے انکار کر دیا تھا۔ اسی جذبے کے تحت یہ چند شعر چند لمحوں کے اندر کہے گئے ہیں۔ (جوشؔ)

غرورِ ادب[1]

میرے جلسے سے اُٹھ آنے پہ خفا ہے ہم نشیں؟
شاعروں کی فطرتِ عالی سے تو واقف نہیں
جوہرِ ذاتی کا جب افسردہ ہوتا ہو وقار
کفر سے بدتر ہے اُس موقع پہ وضعِ انکسار
ناشناسانِ ادب بھولے ہوئے ہوں جب شعور
اُن مواقع پر عبادت کے برابر ہے غرور
دل ہمارا جذبۂ غیرت کو کھو سکتا نہیں
ہم کسی کے سامنے جُھک جائیں، ہو سکتا نہیں
راہِ خودداری سے مر کر بھی بھٹک سکتے نہیں
ٹوٹ تو سکتے ہیں ہم، لیکن لچک سکتے نہیں
حشر میں بھی خسروانہ شان سے جائیں گے ہم
اور اگر پرسش نہ ہو گی تو پلٹ آئیں گے ہم
اہلِ دنیا کیا ہیں، اور اُن کا اثر کیا چیز ہے
ہم خدا سے ناز کرتے ہیں بشر کیا چیز ہے

---

[1] شعلہ و شبنم - ص ۹۵-

دردِ مشترک[1]

سُنتے ہیں طوفان میں ڈوبا ہوا تھا اک درخت
جس کی چوٹی پر ڈرے بیٹھے تھے دو آشفتہ بخت
ایک اُن میں سانپ تھا اور ایک سہما نوجواں
دو ضدوں کا ایک بھیگی شاخ پر تھا آشیاں
سچ ہے دردِ مشترک میں ہے وہ روحِ اتحاد
عشق میں جس سے بدل جاتے ہیں آئینِ عناد
لیکن اے عاقل مسلمانوں، مدبر ہندوؤ!
ہند کے سیلاب میں اک شاخ پر تم بھی تو ہو

---

[1] شعلہ و شبنم - ص ۹۶ -

سعیِ لاحاصل

اے جوشؔ! تنگیوں میں پر افشاں ہوئے تو کیا
بہروں کی انجمن میں غزل خواں ہوئے تو کیا

ہندوستاں غلام ہے، گونگا ہے، سرد ہے
ہندوستاں میں آپ سخنداں ہوئے تو کیا

اک وسوسہ جو قوم ہو خود فی صدورِ ناس
اُس وسوسے میں جذبۂ ایماں ہوئے تو کیا

جس چرخِ تیرہ پر ہو سیہ ابر کا ہجوم
اُس چرخ تیرہ پر مہ تاباں ہوئے تو کیا

جو سرزمینِ شور ہو محرومِ رنگ و بو
اُس سرزمیں پہ ابرِ خراماں ہوئے تو کیا

موجوں نے جس کی توڑ دیا ہو صدف کا دل
اُس جوئے غم میں قطرۂ نیساں ہوئے تو کیا

جس گلستاں میں ایک ہے کانٹا ہو یا گلاب
اُس گلستاں میں سنبل و ریحاں ہوئے تو کیا

ہم وزن و ہم گہر ہوں جہاں، زاغ و عندلیب
اُس گلستاں میں مرغِ خوش الحاں ہوئے تو کیا

جس تیرگی میں ہو نہ سکندر، نہ روحِ خضر
اُس تیرگی میں چشمۂ حیواں ہوئے تو کیا

نکلے نہ صحنِ خانہ سے باہر جہاں نظر
واں آپ کائنات بداماں ہوئے تو کیا

اندھوں سے جب پڑا ہے زمانے میں سابقہ
اے جوشؔ آپ یوسفِ کنعاں ہوئے تو کیا

خونی بینڈ[1]

روح بے چین ہے خاموش ہو اے فوج کے بینڈ
اس طرح صبح کی مخمور ہواؤں میں نہ اینڈ
تجھ میں آواز ہے فولاد شکن تیروں کی!
سنسناہٹ ہے لچکتی ہوئی شمشیروں کی
کتنی ماؤں کے کلیجے کی ہیں قاشیں تجھ میں
کتنے مہ پارہ جوانوں کی ہیں لاشیں تجھ میں
کتنی روندی ہوئی لاشوں کی ہے سردی تجھ میں
کتنی بیواؤں کے چہرے کی ہے زردی تجھ میں
کتنی خوابیدہ ہیں مایوس نگاہیں تجھ میں
کتنے معصوم یتیموں کی ہیں آہیں تجھ میں
تیرا ہر راگ ہے ڈوبا ہوا چشمِ نم میں
رقص خونی کی دھمک ہے ترے زیر و بم میں
سسکیاں تجھ میں ہیں غلطیدہ دل افگاروں کی
کروٹیں موت کی ہیں گت میں تیرے تاروں کی
تیری ہر تان میں پوشیدہ ہیں لاکھوں آنسو
تیری آواز میں غلطاں ہے، جوانوں کا لہو
گم ہیں رستے ہوئے زخموں کی بہاریں تجھ میں
خنجروں کی ہیں مچلتی ہوئی دھاریں تجھ میں

نغمہ ہے لَے میں تیری خون کے فواروں کا
زمزمہ تجھ میں ہے چلتی ہوئی تلواروں کا

تیری آواز جب احساس پہ چھا جاتی ہے
موت کے دل کے دھڑکنے کی صدا آتی ہے۱

۱؎ فکر و نشاط، جوش ملیح آبادی مطبوعہ مکتبۂ جامعہ (پہلا ایڈیشن، ۱۹۳۶ء)

چلائے جا تلوار[1]

ہاں سُنے مجھ بے حیا نے لکھنؤ کے واقعات[2]
کھول اے خونِ جوانی، گونج اے سیرِ حیات
شرم اے ہنگامہ پرور، حائلِ امن و اماں
بے خطا اللہ کے بندوں پہ برسیں گولیاں
ماؤں کے آغوش سے معصوم بچّے چھین کر
خاک پر اس طرح پٹکے جائیں، کیوں اے خیرہ سر
خون کے آنسو بہاؤ، اے زمین و آسماں
فوج بدبیں میں گھریں ہندوستاں کی بیٹیاں
سر قلم ہوں ساز و برگِ تاجداری کے لیے
خون چھڑکا جائے کشتِ شہریاری کے لیے
کچھ خبر بھی ہے تجھے، اے خود فروش و خود پسند
نوعِ انسانی کا سَر ہے تاجِ شاہی سے بلند
اے بباطن محض اک بقال، اے ظاہر میں "شاہ"
پہلے جیبوں پر نظر تھی اب ہے جانوں پر نگاہ
بھیڑیوں کے طور سے کرتا ہے انساں کا شکار
خاک ہو جا اے جہانبانی کے جھوٹے اقتدار
بے کسوں کے خون کو نامرد سمجھے جا حلال
دیکھ خنجر تولنے پر ہے مشیّت کا جلال

عورتوں کی عصمتیں، بچّوں کے دل، بوڑھوں کے سَر
ہاں چڑھائے جا جہانبانی کی قرباں گاہ پر
ہاں کئے جا آبگینیں زندگی کے چور چور
آ چلی ہے عاجزی کی نبض میں موجِ غرور
پیٹ کے بل رینگنے دے خاک پر او دیوِ قہر
آ چلا ہے سانپ کا اس رینگنے سے ہم میں زہر
ہاں سروں پر یوں ہی پیہم ٹھوکریں اے ہرزہ کار
ڈھل رہا ہے جنگ کے سانچے میں ذوقِ انکسار
ہاں یونہیں چلتی رہے تا دیر تیغ شعلہ فام
کروٹیں لینے لگا ہے دل میں جوشِ انتقام
ہاں لیے جا کام یونہیں آتشیں قانون سے
لَو نکلنے ہی پہ ہے مشرق کے ٹھنڈے خون سے
آگ کا بادل فرازِ چرخ پر چھانے کو ہے
اے حکومت کے چمن بادِ سموم آنے کو ہے
ٹھوکریں کھاتا پھرے گا کج کلاہی کا غرور
دب کے بھیجے سے نکل جائے گا شاہی کا غرور

---

[1] حرف و حکایت، جوش ملیح آبادی مطبوعہ کتب خانہ رشیدیہ - دہلی - ص ۲۲

[2] سنہ ۱۹۳۰ء میں لکھنؤ کے اندر بے خطا اور غیر مسلح مجمع پر پولیس نے گولی چلائی تھی۔

وفادارانِ ازلی کا پیام

شاہنشاہ ہندوستان کے نام

تاج پوشی کا مبارک دن ہے اے عالم پناہ
اے غریبوں کے امیر، اے مفلسوں کے بادشاہ
اے گداپیشوں کے سلطان، جاہلوں کے تاجدار
بے زروں کے شاہ، دریوزہ گروں کے شہریار
اے ہمارے عالموں کے "حامئ دینِ مبیں"
دورِ سید کے "اولی الامر" "امیرالمومنیں"
اے رئیس پاک دِل، اے شہریارِ نیک نام
بھوک کی ماری ہوئی مخلوق کا لیجئے سلام
راس کل آئی تھی جیسے آپ کے ماں باپ کو
یوں ہی رسمِ تاج پوشی ہو مبارک آپ کو
دل کے دریا نطق کی وادی میں بہہ سکتے نہیں
آپ کی ہیبت سے ہم کچھ کھل کے کہہ سکتے نہیں
لیکن اتنا ڈرتے ڈرتے عرض کرتے ہیں ضرور
ہند سے واقف کئے جاتے نہیں شاید حضور
آپ کے ہندوستاں کے جسم پر بوٹی نہیں
تن پر اک دھجی نہیں ہے، پیٹ کی روٹی نہیں

تاج پوشی میں جو دی ہیں بھیک میں چند روٹیاں
شکریہ ان روٹیوں کا اے شہ گردوں نشاں

روٹیاں لیکن جو دی ہیں آپ کے خدام نے
آسکیں گی کیا یہ کل کی اشتہا کے سامنے؟

آج کی دو روٹیوں سے چین ہم پائیں گے کیا!
کھا بھی لیں گے آج اگر ڈٹ کر تو کل کھائیں گے کیا؟

صرف سڑکوں کے چراغاں سے نہیں چلتا ہے کام
کچھ دلوں کی روشنی کا بھی کیا ہے اہتمام؟

آپ کے پرچم کے نیچے ہے جو قوم نامراد
کھائے جاتا ہے اسے خدامِ عالی کا عناد

معدہ محرومِ غذا ہے، کعبہ ہے محرومِ زر
آپ کے عمال نے لوٹا ہے ہم کو اس قدر

آپ کے فرقِ مبارک کو دیا ہے جس نے تاج
آج اس بھارت کا سر ہے اور تیغِ احتیاج

ہر جبیں پر ہے شکن، اس کج کلاہی کی قسم
ہر مکاں اک مقبرہ ہے، قصرِ شاہی کی قسم

آپ کے سر پر ہے تاج اے فاتحِ روئے زمیں
اور ہم اہلِ وفا کے پاؤں میں جوتی نہیں

ہم وفا کیش آپ کی نظروں سے بھی گر جائیں گے؟
آپ بھی ہم سے خدا کی طرح کیا پھر جائیں گے؟

ا؎ حرف حکایت - ص ۳۲ -

آدمی دے اے خدا؟[1]

اے خدا، ہندوستاں کو بخش ایسے آدمی
جن کے سر میں مغز ہو، اور مغز میں تابندگی
جن کی فکرِ تازہ میں ہو اجتہادی بانکپن
جن کی عقلوں پر نہ ہو بارِ روایاتِ کہن
جن کی رگ رگ میں ہزاروں بجلیاں ہوں بیقرار
جن کے دل مضبوط ہوں، جن کی اُمنگیں شعلہ بار
موت کو پوجیں جو عمرِ جاودانی کی طرح
خون جو اپنا بہا سکتے ہوں پانی کی طرح
عزم جن کے خندہ زن ہوں ثابت و سیّار پر
ذہن جن کے سانس لیں اوجِ سرِ کہسار پر
جو جئیں، تدبیرِ تسخیرِ جہاں کے واسطے
اور مریں بھی تو فقط ہندوستاں کے واسطے
جن کے آگے ہوں گرجتی بدلیاں چنگ و رباب
زندگی کیا، کھیلتا ہو موت سے جن کا شباب
جن کی ہر موجِ نفس میں ہو خروشِ زندگی
جن کا ہر نقشِ قدم ہو اک ستونِ روشنی
جن کے سینوں میں ہوں روشن حبِ ملت کے چراغ
دل تو دل، دل کی طرح جن کے دھڑکتے ہوں دماغ

جن کے بربط میں دہکتی زندگی کا راگ ہو
جن کے دل میں ولولے ہوں، ولولوں میں آگ ہو
جن کی شمعِ فکر ہو روشن ترا ز مہرِ منیر
سبحہ و زنّار میں جکڑے نہ ہوں جن کے ضمیر
ناسزا اوہام کر سکتے نہ ہوں جن کا شکار
گائے، باجے پر نہ ہو جن کے عقائد کا مدار
اے خدا ہم کو نزاعِ کفر و ایماں سے بچا!
اپنے ہندو سے بچا، اپنے مسلماں سے بچا!
روح کی رفعت سے ہوں جو آسمانی آدمی
دے ہمیں بارِ خدا "ہندوستانی" آدمی!
الغرض میرے وطن کو زندگی دے اے خدا!
آدمی دے، آدمی دے، آدمی دے، اے خدا!

لہ حرف حکایت - ص ۴۳ -

حُبِّ وطن اور مسلمان!

ظرف، اور اِس حد کا تنگ اے حامیٔ دینِ مبیں
حیف اے نا آشنائے "رحمۃً للعالمیں"!
اختلافِ مذہب و ملّت پر اور اتنا جلال!
بھائیوں کے خونِ ناحق کو سمجھتا ہے حلال!
حیف اے دیوار کے پابند اے در کے اسیر
اپنے جرگے، اپنے گنبد، اپنے منبر کے اسیر
دل پہ تیرے نقش ہے وہ فلسفہ ادیان کا
کاٹتا ہے رشتہ جو انسان سے انسان کا!
چھین لیتا ہے جو لطفِ باہمی کے قہقہے
قلب میں پھنکارنے لگتے ہیں جن سے اژدہے
مذہبی اخلاق کے جذبے کو ٹھکراتا ہے جو
آدمی کو آدمی کا گوشت کھلواتا ہے جو
مجھ سے کیا کرتا ہے ہندو کے تعصب کا گِلا؟
مجھ سے کیوں کہتا ہے ہندو کی جفا کا ماجرا
تنگ فکر و تنگ داماں، تنگ ظرف و تنگ جیب
مان بھی لوں میں کہ ہندو عیب ہے اور زندہ عیب
فرض بھی کر لوں کہ ہندو، ہند کی رسوائی ہے
لیکن اس کو کیا کروں، پھر بھی وہ میرا بھائی ہے!

مرد اگر ہوں، بھائیوں کا خون پی سکتا نہیں
بھائیوں کا خون اگر پی لوں تو جی سکتا نہیں!

باز آیا میں تو ایسے مذہبی طاعون سے
بھائیوں کا ہاتھ تر ہو، بھائیوں کے خون سے!

سبحۂ و زنار کی لہروں ہی پہ بہتا ہے تو
اور اس تنگی پہ مجھکو کم نظر کہتا ہے تو!

تیری ہستی تنگ نائے کفر و ایماں کے لیے
میں بنا ہوں آب و رنگِ نوعِ انساں کے لیے!

گو بجتی ہیں قصرِ آفاقی میں آوازیں مری
کفر و ایماں سے بہت بالا ہیں پروازیں مری!

لیکن اس کے ساتھ ہی، اے مبتلائے کفر و دیں
دولتِ حبِ وطن کو چھوڑ دوں، ممکن نہیں

حصہ ہے سب سے مقدم زندگی "خویش" کا!
"خویش" سے بچ جائے تو پھر مال ہے "درویش" کا!

سعی کرنا چاہیے پہلے تو گھر کے واسطے
گھر سے فرصت ہو تو پھر نوعِ بشر کے واسطے

تیرے لب پر ہے عراق و شام و مصر و روم و چیں
لیکن اپنے ہی وطن کے نام سے واقف نہیں!

کون کہتا ہے زمین و آسماں تیرا نہیں؟
کل جہاں تیرا، مگر ہندوستاں تیرا نہیں!!

مردِ حق کو قصرِ باطل سے اُبھرنا چاہیے
کعبۂ حبِ وطن میں سجدہ کرنا چاہیے!

سب سے پہلے مرد بن ہندوستاں کے واسطے
ہند جاگ اُٹھے تو پھر سارے جہاں کے واسطے

لہ حرف و حکایت - ص ۱۵ -

نوجوان سے خطاب[1]

اُٹھ اور زمیں پہ نیا لالہ زار پیدا کر
نہ آئی ہو جو کبھی وہ بہار پیدا کر

عقولِ مردہ و مرطوبِ نوعِ انساں میں
شرارِ شعلہ و دود و بخار پیدا کر

مٹا دے سلسلۂ آلِ تخار و نسلِ جحیم
اُٹھ اور ملّتِ حکمت شعار پیدا کر

ضمیرِ اہلِ مناجات سے کے تعطّل میں
خروشِ جذبۂ تکمیلِ کار پیدا کر

نئے اصولِ سزا و جزا کی دے تعلیم
نیا تخیلِ روزِ شمار پیدا کر

نظامِ کہنۂ نیلی رواق، وہم و فریب
نیا تصورِ لیل و نہار پیدا کر

غلط ہے سازِ عجم ہو کہ لحنِ اعرابی
نیا ترانہ سرِ شاخسار پیدا کر

بہت بلند ہے سطحِ مذاقِ فکرِ جدید
نظر میں اوجِ سر کوہسار پیدا کر

جمی ہوئی ہے دماغوں پہ برف مدت سے
دلوں میں دولتِ برق و شرار پیدا کر

فسردہ گامیِ اہلِ جہاں کے حلقے میں
جواں خرامیِ ابرِ بہار پیدا کر

کلاہِ خواجگیِ کائنات کج کر کے
نیا زمانہ، نیا روزگار پیدا کر

الٰہِ دہر ہے تو، یہ گدائیاں تا چند؟
نظر میں سطوتِ صد شہریار پیدا کر

بہار میں تو زمیں سے بہار اُبلتی ہے
جو مرد ہے تو خزاں سے بہار پیدا کر

مذاقِ بندگیِ عصرِ نو کی تجھ کو قسم
نئے مزاج کا پروردگار پیدا کر

---

[1] حرف و حکایت۔ ص ۷۳۔

محرومِ تمغہ[1]

سُنا ہے چیف کمشنر کا شام کو دربار
لئے ہوئے تھا شکوہِ خدیو و صولتِ جم
اِدھر غلام تھے، اُس سمت حاکمِ جبّار
اِدھر مریض تھے، اُس سمت عیسیٔ مریم
اِدھر فنا کی اُداسی، اُدھر بقا کی بہار
اِدھر حدوث کا شیون، اُدھر خروشِ قدم
اُدھر تھے بخت سے دلدادگانِ چمن و رام
اُدھر تھے خیر سے وابستگانِ خیرِ اُمم
اُدھر تھا قلعۂ شاہی، جوابِ گورستان
اِدھر تھا قصرِ فرنگی، مثالِ باغِ ارم
وہ لوگ جن کے اب وجد تھے قلعہ گیر و دلیر
کھڑے ہوئے تھے بہ اندازِ دخترانِ حرم
ہر اک ادا سے یہ آتی تھی پے بہ پے آواز
"ہمیں نہ چھیڑنا دیکھو تمھیں خدا کی قسم"
لرز رہی تھی غرورِ فرنگ کے آگے
وہ قوم، تھی جو کبھی رازدارِ سیف و قلم
جوارِ شاہ میں ہر شخص تھا شگفتہ و شاد
عطائے تمغہ سے ہر فرد تھا خوش و خرّم

اگرچہ ہیبتِ شاہی سے نطق تھے بے کار
ہر ایک چہرہ مگر کہہ رہا تھا یہ پیہم
"کہ حکم اگر ہو تو ادنیٰ سے اک اشارے پر
تمام قوم کے دم بھر میں سر اُڑا دیں ہم"
"تمام قوم ہے کیا چیز اے شہ ذی جاہ
فدائے طرۂ تاجِ تو مادر و پدرم"
ہر ایک چیز تھی القصہ زیب و زین میں غرق
سوائے کاکلِ حبِّ وطن کہ تھی برہم
وطن کے حق میں ہوائیں ہیں جس کی بادِ سموم
فضا میں شان سے لہرا رہا تھا وہ پرچم
بقدرِ سعئ برادر کشی و بغضِ وطن
برس رہا تھا ہر اک کے چمن پہ ابرِ کرم
رہینِ کیف و طرب تھے تمام درباری
سوائے حضرتِ "فاضل" کہ تھے اسیرِ کرم
کہا کسی نے کہ حضرت مزاج کیسا ہے؟
یہ کس ملال سے رُخ زرد اور چشم ہے نم؟
یہ سُن کے حضرتِ "فاضل" نے آہ بھر کے کہا
ہنسائے جائیں حریف اور رلائے جائیں ہم
خبر بھی ہے کہ بہ تقریبِ تاج پوشئ شاہ
مری غذا نے بھرے تھے گداگروں کے شکم

بس ایک بار غریبوں پہ رحم آیا تھا
سو وہ بھی ازپئے خوشنودیٔ شہِ اکرم
عطا ہوں دوسروں کو تمغہ ہائے خوشنودی
ہماری سمت نہ لیکن پھرے نگاہِ کرم

جگر نہ خون ہو کس طرح اس تماشے سے
"کہ مے خورند حریفاں و من نظارہ کنم"!

لہ حرف حکایت۔ ص ۷۶۔

رازِ حیات

بزدلی، دوں ہمتی، بے مائگی، خوابِ گراں
تجھ پہ اور یہ لعنتیں، افسوس اے ہندوستاں
برچھیاں محزوں، بگل خاموش، پرچم تار تار
خود غمگیں، طبل جنگ افسردہ، نیزے دلفگار
دل میں خوفِ مرگ، رُخ پر بزدلانہ اضطراب
ولولے، سر در گریباں، ہمتیں مصروفِ خواب
کرب سے خنجر فسردہ، خستہ جانوں کی طرح
غم سے تیروں کی کمریں خم کمانوں کی طرح
عزم کے مضبوط رشتے ہاتھ سے چھوٹے ہوئے
زنگ کے پردوں میں تلواروں کے دِل ٹوٹے ہوئے
ہند کچھ سُنتا نہیں کس سے کہوں یہ ماجرا
یہ ہے انسانوں کا جنگل کون سُنتا ہے صدا
کون ہندو سے کہے اے لالۂ دولت نواز
اب بھی ہے کیا جگجو گردانِ مہابھارت پہ ناز
کون مسلم سے کہے اے مومنِ زار و نزار
لا فتیٰ اِلّا علی لا سیف اِلّا ذو الفقار

کشتیٔ ملت کو اس طوفان میں کھینے کے لیے
کون بڑھتا ہے لہو تھوڑا سا دینے کے لیے؟
آہ اے ہندوستاں، مشرق کی اے تاریک رات
کہہ رہا ہوں کب سے میں کمبخت، یہ رازِ حیات
باگ میں ہے شہ سواروں کی نظامِ زندگی
اسلحہ کی کھڑکھڑاہٹ ہے پیامِ زندگی
جان لے اے ہند، اے ذرّات کے خادم پہاڑ
موم بن جاتا ہے لوہے سے جو کرتا ہے بگاڑ
صرف ہلکی آنچ کی یورش سے گل جاتا ہے موم
گرمیٔ اغیار کے سانچے میں ڈھل جاتا ہے موم

تجکو لوہا بن کے دنیا میں اُبھرنا چاہیے
یہ اگر ہمت نہیں تو ڈوب مرنا چاہیے

۱؎ حرف و حکایت ۔ ص ۱۱۱ ۔

وفاق[1]

دھومیں مچی ہوئی ہیں نظامِ وفاق کی
ہندوستاں ہنوز ظلوم و جہول ہے
اس نوحۂ خزاں کو سمجھتا نویدِ گلُ
اک بے پناہ چوک ہے اک سخت بھول ہے
یہ بوستانِ اہلِ سیاست کی شاخ گلُ
شیطاں کے پائیں باغ کی سوکھی ببول ہے
یہ ہے نیا نکاح کہ دولہا تو ہے خموش
قاضی یہ کہہ رہا ہے کہ دل سے قبول ہے
ہشیار اہلِ ہند کہ پھر اس زمین پر
گردوں سے ایک تازہ بلا کا نزول ہے
کہتے ہیں جس کو "دولتِ بیدار" اہلِ غرب
وہ اک متاعِ کاسد و جنسِ فضول ہے

ناداں اکڑ رہے ہیں کہ حاصل ہوا وفاق
دانا سمجھ رہے ہیں کہ اپریل فول ہے

---

[1] حرف و حکایت ۔ ص ۱۲۸ ۔

ریاستوں کا ملکی نعرہ

ہلاکِ جور کر دو، کشتۂ بیداد کر ڈالو
یہ کافر غیر ملکی ہیں انھیں برباد کر ڈالو
نئے مصحف، نئے دیوان و دفتر کی بنا ڈالو
کتابیں غیر ملکی دین و مذہب کی جلا ڈالو
مری صہبا ہو، میرا ہی سبو، میرا ہی پیمانہ
مرے گھر کا حرم ہو، میرے ہی صوبے کا بت خانہ
میں اب سمجھا کہ یہ اک غیر ملکی کا تخیل تھا
کہ فرقِ رنگ و نسلِ قوم ہے ابلیس کا دھوکا
اگر تقدیر یاور رہے تو منھ غیروں سے موڑوں گا
لباسِ نوعِ انسانی کے ٹکڑے کر کے چھوڑوں گا
لبِ تقسیمِ ارضی ہی سے اب آئندہ بولوں گا
میں اب انسان کو مٹی ہی کے کانٹے میں تولوں گا
نہ ہوں گے صورتِ انسانی کے شعبے تکڑی ہی لئیں
فقط جغرافیہ کا خون ہے میری رگ و پے میں
ہمیں اور رحم آئے غیر ملکی ہم سفیروں پر!
کہ تجروں کی بنا ہے صرف نقشوں کی لکیروں پر

اُخوت کے سمندر کو خزف ریزوں سے پاٹوں گا

میں رشتے خون کے سب خاک کی قینچی سے کاٹوں گا

رو . .

اور مجبور

مشاعرہ

بُریدہ ہو کے اپنے کُل سے بعض جزو چلتی ہے

کہ کٹ جاتی ہے جب تو چھپکلی کی دُم مچلتی ہے

ف ______________________________

ف وحکایت ۔ ص ۱۳۳ ۔

بوڑھے نوجوان

اے میرے ہندوستاں کے مردہ خصلت نوجواں
تیرے خال و خط میں پیری کے نشاں پاتا ہوں میں

تیرے بے سالار اندھے کارواں کی راہ میں
ہر قدم پر اک بلائے ناگہاں پاتا ہوں میں

جس کو تو سمجھے ہوئے ہے ایک بے پایاں عروج
اُس کو تمہیدِ زوالِ بیکراں پاتا ہوں میں

سخت حیراں ہوں کہ اے ناداں بہ ایں افلاس و جہل
تجھ کو مشتاق شرابِ ارغواں پاتا ہوں میں

تیرے مستقبل کی جانب جب اُٹھاتا ہوں نگاہ
چرخ پر اُڑتی ہوئی کچھ دھجیاں پاتا ہوں میں

دوشِ آبا پر تیری ہستی کو اے ننگِ حیات
جو نہ اُٹھ سکتا ہو وہ بارِ گراں پاتا ہوں میں

حیف تیری نوجوانی پر ہیں پیری کے نشاں
دوسری قوموں کے بوڑھوں کو جواں پاتا ہوں میں

زندہ قوموں کے جواں ہیں چہرۂ آبا رکے رنگ
اور تجھے روئے پدر کی جھرّیاں پاتا ہوں میں

آگ بجھ جائے گی چھاتی سرد و نم ہو جائے گی
چونک! ورنہ زندگی کی پشت خم ہو جائے گی

فطرتِ اقوام

ظلمِ لا انتہا سے تنگ آ کر
آدمی چاہتا ہے آزادی

ہو کے آزاد پھونک دیتا ہے
دوسرے بھائیوں کی آبادی

پہلے بنتا ہے دشمنِ جلاد
خود ہی پھر سیکھتا ہے جلادی

خود کو آباد کر کے یہ حیوان
ڈال دیتا ہے طرحِ بربادی

پا کے اپنے حقوق اوروں کے
چھینتا ہے حقوقِ بنیادی

پہلے تو ظالموں سے ڈرتا ہے
اور پھر خود ہی ظلم کرتا ہے

(۱۹۲۸ء)

کارل مارکسؔ [1]

السلام اے مارکس، اے دانائے راز
اے مریضِ انسانیت کے چارہ ساز
نخلِ خوشحالی کی بیخ و بُن ہے تو
عقدہ ہائے زیست کا ناخن ہے تو
تجھ سے قائم دہر میں محنت کا حق
تجھ سے امرت، گرم ہاتھوں کا عرق
اے دبیرِ دہر و پیرِ حق پناہ
نشترِ فصّاد تیری ہر نگاہ
مانتیں قومیں اگر تیرا نظام
آج تلواریں نہ ہوتیں بے نیام
پھر بھی اک عالم میں ہے تابندگی
تیری جانب مُڑ رہی ہے زندگی
اے کہ تجھ سے مبتلائے خلفشار
عُجبِ زردار و غرورِ شہریار
اے کلیدِ قفل و بابِ رنگ و نُو
اے حکیمِ نَو، کلیمِ تازہ طُور
داروئے بدحالی و آوارگی
اے طبیبِ علّتِ بیچارگی

اے خطیبِ منبرِ فیضِ عمیم
اے ضیائے مشعلِ رزقِ کریم
خیر خواہِ جملہ اقوام و ملل
رازقِ بے قیدِ "ایمان و عمل"
ہاں علی الرغم نظامِ "عرشِ پاک"
اے دوائے جملہ علت ہائے خاک
اے پیامِ آب بہرِ تشنگاں
اے نویدِ ناں برائے خستگاں
اے گدائے راہ و شاہِ شش جہت
اے ابوالافلاس و ابنِ مرحمت
دشمنِ پیمانۂ پست و بلند
حامیٔ بیچارگانِ دردمند
آبگینے سے تیرے سکتے ہیں سنگ
اے کہ تو اُترے ہوئے چہروں کا رنگ
اے کہ تو جامِ سفالیں کا بھرم
اے کہ تو سازِ شکستِ جامِ جم
اے کہ تو برقِ سحابِ غم کشاں
اے کہ تو دردِ دماغِ خسرواں
اے کہ تو "آہن شکن" آئینہ ساز
عارفِ "شاہیں" کش و قمری نواز

اے کہ تیری ہر نگاہِ نکتہ یاب
صحت "ذرات" و مرگِ "آفتاب"

ہمدمِ شبیرؑ و بدخواہِ "یزید"
موسئ نو بہرِ فرعونِ جدید

اے عدوئے "نوریانِ شعلہ خو"
اے انیسِ "خاکیانِ مردہ رو"

اے رفیقِ خستگانِ بے نوا
اے کلاہِ بے کلاہانِ جہاں

منکرِ دارائی "عرشِ بریں"
اولیں پیغمبرِ فرشِ زمیں

ہند را، آتش بہ جامے دادۂ
پائے شل را ہم خرامے دادۂ

روسِ تو رقصندہ و رخشندہ باد
زندہ و پائندہ و تابندہ باد

(۱۹۴۲ء)

لہ عرش و فرش، جوش ملیح آبادی، مطبوعہ تاج آفس بمبئی ۱۹۴۲ء ص ۱۸۵۔

نوخیزانِ کمیونسٹ پارٹی سے

خاک کے ذرّوں پہ تاروں کا گماں ہونے تو دو
دوستو، ٹھہرو زمیں کو آسماں ہونے تو دو
ناخنِ عجلت سے عقدے وقت سے کھلتے نہیں
خود کو پہلے رازبین و رازداں ہونے تو دو
غرق ہو جائے گی شیخ و برہمن کی برہمی
جوئے امواجِ اخوت کو رواں ہونے تو دو
عرش و کرسی کی بلندی کا بھرم کھل جائے گا
پہلے سجدوں کو امینِ آستاں ہونے تو دو
تم نے کاوش سے بنایا ہے جو یہ کوہِ گراں
اک نفس ٹھہرو، اسے آتش فشاں ہونے تو دو
آنچ لہراتی نظر آئے گی سقف و بام پر
شعلۂ مفلس کو منعم پر عیاں ہونے تو دو
جن کا مرکب برق ہوگی، جن کا پرچم آفتاب
خیر سے اُن کاروانوں کو رواں ہونے تو دو
دور سے لَو دے اُٹھے گا روئے منزل دیکھنا
رہ رَووں کو مہ چکان و خور فشاں ہونے تو دو
مے کدے میں اک نئے انداز سے ہوگی نماز
قلقلِ مینا کو گلبانگِ اذاں ہونے تو دو

جگمگا اُٹھے گی محرابِ خراباتِ کہن
مُغ بچّوں کو ہمسرِ پیرِ مُغاں ہونے تو دو
محو ہو جائے گا نظمِ کہنۂ سرو و سمن
نو خرامانِ چمن کو باغباں ہونے تو دو
ثابت و سیّار بن جائیں گے ذراتِ چمن
کاہِ بے مایہ کو ہیرِ کہکشاں ہونے تو دو
گونج اُٹھے گا سازِ عشرت سے زمین و آسماں
ہندیوں کو مطربِ ہندوستاں ہونے تو دو
ذہنِ انسانی کے سروِ پا بہ گِل کو دوستو
موجِ حرفِ زندہ سے سروِ رواں ہونے تو دو
تختِ سیمیں کو جلا دیں، تاجِ زر کو پھونک دیں
دل جلوں کو اس قدر آتش بجاں ہونے تو دو
کاسہ بن جائے سبک ہو کر کلاہِ خسروی
سرگراں یاروں کو اتنا سرگراں ہونے تو دو
سود کے چشمے اُبل پڑتے ہیں جس کے فیض سے
روح کو اس حد کا احساسِ زیاں ہونے تو دو
خود بہ خود محبوب کے اعضا میں توج آجائے گا
گنگناتے ولولوں کو نغمہ خواں ہونے تو دو
عربدوں کے تیر خود ہو جائیں گے سینوں کے پار
ابروئے خمدار کی دُہری کماں ہونے تو دو

خود بہ خود ساغر چھلک اُٹھیں گے کھل جائیں گے پھول
مہ وشوں کی انکھڑیوں کو مے فشاں ہونے تو دو

عام ہو جائے گا ہاں اک روز رازِ دلبراں
ابتداً در حدیثِ دیگراں ہونے تو دو

آسماں افسوں بہ لب ہوگا زمیں افسانہ خواں
زندگی کو داستاں در داستاں ہونے تو دو

جن کی مہکوں میں ہے جادو، جن کی موجوں میں جنوں
دوش پر اُن گیسوؤں کو پُرفشاں ہونے تو دو

مسکرا کر اپنا جوڑا کھول دے گی کائنات
طفلکِ ناپختہ مستی کو جواں ہونے تو دو

(نومبر ۱۹۴۵ء)

لہ سنبل و سلاسل مطبوعہ تاج آفس بمبئی ، ۱۹۴۷ء (پہلا اڈیشن) ص ۹ -

وقت کی آواز[1]

اے دوستانِ برہم و یارانِ مُردہ ہوش
اے شعلگی بہ سینہ و آشفتگی بہ دوش
تا کے یہ غل یہ گونج، یہ ہنگامہ یہ خروش
کچھ کہہ رہی ہے مادرِ ہندوستاں خموش
صد حیف وقت مہر بھی غصے میں بھوت ہو
ماں کے قریب آؤ اگر تم سپوت ہو
بازارِ ہست و بود میں ارزاں ہو کس لیے
اس نرخِ شرمناک پہ نازاں ہو کس لیے
وحشت کا سیل، بغض کا طوفاں ہو کس لیے
اک دوسرے سے دست و گریباں ہو کس لیے
آؤ سُنو بھی مادرِ ہندوستاں کی بات
بیٹا وہی شریف ہے مانے جو ماں کی بات
وہ کہہ رہی ہے دل میں کدورت نہ چاہیے
اچھے تو کیا بُروں سے بھی نفرت نہ چاہیے
کہتا ہے کون پھول سے رغبت نہ چاہیے
کانٹے سے بھی مگر تجھے وحشت نہ چاہیے
کانٹے کی رگ میں بھی ہے لہو سبزہ زار کا
پالا ہوا ہے وہ بھی نسیمِ بہار ــــــ کا

یہ خشک جھاڑیاں کہ پریشاں ہیں جا بجا
پھولوں کے خاندان سے ہیں دیکھتا ہے کیا
ٹھکرا کے برگِ زرد کو چلنا نہیں روا
اس انتہا میں دیکھ جھلکتی ہے ابتدا

کل اس ورق پہ رنگ چھڑک کر شراب کا
خاکِ چمن نے روپ بھرا تھا گلاب کا

اور تم کہ بھائیوں سے ہو مصروف گیر و دار
کیا ترک خزاں کو دو گے کہ ہو دشمنِ بہار
کیا کھا کے بن سکے گا بھلا وہ رفیقِ کار
جس کی خوشی کا گل کے مسلنے پہ ہو مدار

واری یہ غصہ تھوک دو، یہ تاؤ چھوڑ دو
آپس کا بن پڑے تو یہ کٹیاؤ چھوڑ دو

ناقوس، گائے باجے، تماشے، جلوس اذاں
بنوٹ، کمند، پیترے، بانا، تبر، سِناں
لّلاچیاں، جھکائیاں، آوازے، اوکھیاں
ان ہست کنڈوں پہ فرو ہے ہر تیس مار خاں

ہر قوم کی نگاہ سے گو گر رہے ہو تم
مونچھوں پہ تاؤ دیتے مگر پھر رہے ہو تم

غل، شور، دھینگا مشتیاں، لٹھ پونگا، مار دھاڑ
گلیاؤ، لام لاف، دھما چوکڑی، لتاڑ

پتھراؤ، داؤں پیچ، اُچھل کود، دھر پچھاڑ
دیکھو تو اپنی صورتیں، سر جھاڑ، منھ پہاڑ
آنکھوں کا پانی مر گیا تو کیا ڈرے گا کوئی
جب منہ پہ لوٹی پھبری، پھر کیا کرے گا کوئی

کیا تم کو ناؤ قوم کی ڈوبے کہ پار ہو
تم مادرانِ فردِ خزاں و بہار ہو
تم جیت جاؤ خواہ دو عالم کی ہار ہو
تم اپنی ماں کے ہائے وہ تیماردار ہو
پروا بھی جن کو چارۂ آزار کی نہیں
صرف اپنی جن کو فکر ہے بیمار کی نہیں

تم کو تو خیر سے ہے یہی فکر صبح و شام
بس پانچویں سواروں میں چھپ جائے اپنا نام
اونچی ہو اپنی بات چھلک جائے اپنا جام
تم اپنے حلوے مانڈے سے رکھتے ہو صرف کام
تم من چلوں کو ہے تو فقط لیڈری کی دُھن
ملحد ہو پھر بھی رہتی ہے پیغمبری کی دُھن

تم کو یمن کا درد، نہ لعل یمن کا درد
تم کو نہ گل کا درد، نہ سرو سمن کا درد
تم میں سے ایک کو بھی نہیں ہے وطن کا درد
وہ بلبلیں ہو جن کو نہیں ہے چمن کا درد

تم دوڑتے ہی کب ہو کہ آؤ جھپیٹ میں
چل جائے بس تو باغ کو خود رکھ لو پیٹ میں

ہاں ہاں چلا رہے ہو بڑے طنطنے سے ناؤ
تم کتنے پانی میں ہو، میں سب جانتی ہوں جاؤ
تم حاکموں کو جتنا دکھاتے ہو اپنا تاؤ
اتنا ہی سورماؤ، بڑھاتے ہو اپنا بھاؤ

محلوں میں لیڈروں کی بڑی مان دان ہے
منڈوا نہیں ہے بلکہ تمہاری دُکان ہے

تم بار بار دیکھتے رہتے ہو پیش و پس
سب کو پھلانک جاتے جو چلتا تمہارا بس
آتا ہے اس مزاج پہ مجکو بڑا ترس
تم بلبوں اُچھالتے ہو اس لیے فرس

باصد شکوہ برسرِ بازار دیکھ لیں
تا ہم کو لیڈروں کے خریدار دیکھ لیں

صد حیف ہر قدم پہ ہیں دس لاکھ ٹولیاں
جن میں سے کچھ سپنولے ہیں اور کچھ سنپولیاں
چندوں سے بھرتی رہتی ہیں دن رات جھولیاں
سب اپنی اپنی بولتے رہتے ہیں بولیاں

ان سب کو کام ہے تو فقط اپنے کام سے
کانوں پہ ہات رکھتی ہوں میں ان کے نام سے

میرے تو بس ہیں تین چمکتے ہوئے نگیں
اک کانگرس کہ ہے وہ بلوٹھی کی نازنیں
اور لیگ اُس کی بیٹھ کی بچی قمر جبیں
اور کمیونسٹ ہے مرا فرزندِ نکتہ بیں
سانچے میں روشنی کے ہیں گویا ڈھلے ہوئے
میرے ہی دودھ سے ہیں یہ تینوں پلے ہوئے

کانگرس سے خطاب

ہاں بیٹا کانگریس ذرا اس طرف تو آ
یہ کیا میں سُن رہی ہوں کئی دن سے چخ چخا
چھوٹوں کا تجھ کو پاس مری جاں نہیں رہا
ہاں ہاں بڑوں کا ہے یہی دستور مرحبا
ثابت ترے پتنگ کا پیٹا نہیں رہا
کیا تجھ کو ماں کا دھیان بھی بیٹا نہیں رہا

کل جگ ہے یہ، کسی کا نہیں کوئی ہائے اب
ہے ہے، یہ انیائے، یہ اندھیر، یہ غضب
تو کوستی ہے بھائی کو اور وہ بھی بے سبب
ماں جائے کی تو خیر مناتے ہیں روز و شب
خود سوچ کیا ملے گا تجھے اُس کو کوس کے
تو نے بڑا کیا ہے جسے پال پوس کے

تو یوں تو زور دیتی ہے دل کی صفائی پر
مائل نہیں جہاں میں کسی کی برائی پر
دل میرا خون ہے مگر اس کج ادائی پر
کس جی سے تو زبان چلاتی ہے بھائی پر
کیوں ہیں ترے نقوشِ محبت مٹے ہوئے
بہنوں کی چاہ کے تو ہیں ڈنکے پٹے ہوئے
پروان چڑھ کے ہات یہ تیرا بٹائے گا
طوفان میں یہی تری کشتی چلائے گا
ساون میں تان جبکہ پپیہا سنائے گا
میکے سے ڈولی لے کے یہ بیرن ہی آئے گا
ہو جائے پھر ملاپ بہن اور بھائی میں
اُٹھ اور راکھی باندھ دے اُس کی کلائی میں
سچ ہے کہ اتحاد پر ایمان ہے ترا
جیسی دکان ویسا ہی پکوان ہے ترا
پھیلا ہے جس میں نور وہ میدان ہے ترا
ہاں پورے خاندان پہ احسان ہے ترا
رعبِ عدو کا پنجہ مروڑے ہوئے ہے تو
اغیار کے غرور کو توڑے ہوئے ہے تو
کڑکا چکی ہے جنگ میں سو بار تو کماں
سر کر چکی ہے معرکۂ کاہ و کہکشاں

وا کر چکی ہے ہر شکنِ زلفِ این و آں
باقی جو ہیں تو صرف اب آنکھوں کی سوئیاں
لیلائے آب و رنگ کا ڈیرا قریب ہے
تارے لرز رہے ہیں سویرا قریب ہے

تو نے ہی طرزِ کہنہ کی کاٹی ہیں بیڑیاں
تو نے ہی قطع کی ہے نحوست کی ریسماں
خود داریوں کی تو نے ہی چھیڑی ہے داستاں
تیری ہی بادِ صبح سے مہکا ہے بوستاں
جاگی ہے تیری چاپ سے دنیا جمال کی
چٹکی ہیں تیری سانس سے کلیاں خیال کی

فقرِ گدا میں شانِ کیانی تجھی سے ہے
پیری کی ہڈیوں میں جوانی تجھی سے ہے
دریائے کشمکش میں روانی تجھی سے ہے
زہرہ عدو کی آگ کا پانی تجھی سے ہے
گردن کے خم سے تیغ کو نیچا دکھا دیا
تو وہ ہے جس نے موم سے لوہا جھکا دیا

مجھکو تو کیا کسی کو بھی اس میں نہیں کلام
تلوار سب سے پہلے ہوئی تیری بے نیام
تو نے ہی سب سے پہلے لیا حریّت کا نام
تو جملہ اہلِ عزم کی ہے اوّلیں امام

تیرے ہی حرفِ گرم کا سینوں میں شور ہے
احسان بھول جائے جو تیرا وہ کور ہے

لیکن بس ایک بات سے لگتا ہے مجکو ڈر
بدلی ہوئی ہے دیر سے بٹیا تری نظر
مندر کی پاسبان ہے، مسجد سے بے خبر
تسبیح پر ہے قہر، جنیؤ پر ہے نظر

اس میرے اعتراض کو دل سے قبول کر
گنگا کی رو پہ مست ہے، کوثر کو بھول کر

ہاں جانتی ہوں میں تری نیّت بری نہیں
تیرا بطون صاف ہے روشن تری جبیں
لیکن ترے مکاں میں ہیں کچھ دن سے وہ مکیں
جو دوستانِ دھرم ہیں، اور دشمنانِ دیں

وضعِ غلط پہ ہار ہے تیرا گندھا ہوا
اس ہار سے اذاں کا گلا ہے رندھا ہوا

یوں تو نہیں ملے گی کبھی منزلِ نجات
جیتوں گی اپنے بل پہ یہ باتیں ہیں واہیات
راتوں کو دن بنا کے، دنوں کو بنا نہ رات
کہنی ہے ایک بات تو کرتی ہے ایک بات

دل تو وہ شئے ہے غیر سے بھی صاف چاہیے
گر یہ نہ ہو تو گھر میں تو انصاف چاہیے

رانی ہے جس کا نام وہ مُردار ہے بڑی
ہشکانے سے اُسی کے مچی ہے یہ گڑبڑی
وہ اک نہ ایک چھوڑتی رہتی ہے پھل جھڑی
ہاں بھس میں چنگی ڈال جمالو الگ کھڑی
گرجا کی شہ پہ جنگ حرم اور دیر کی!
اپنوں سے کوئی لڑتا ہے پڑ چک پہ غیر کی
گرگی ہے اس کی ڈھول کا کھلتا نہیں ہے پول
چھُریاں بھری ہیں دل میں زباں پر ہیں میٹھے بول
آج اور سے ٹھٹول ہے، کل اور سے ٹھٹول
آج اُس سے میل جول ہے، کل اُس سے میل جول
تکیہ کبھی نہ کیجیو اُس اُچلی چیل پر
گنگا پہ بیٹھتی ہے کبھی جا کے نیل پر
میٹھی ہے وہ زبان کی دل کی کٹھور ہے
قطامہ ہے، چڑیل ہے، شفتل ہے، چور ہے
ڈلا کی اُس میں گھات ہے، ڈائن کا زور ہے
اُس کا نہ اور ہے کوئی بیٹا نہ چھور ہے
نارد مُنی کی بھی ہے وہ نانی سمجھ گئی؟
پیچھے کچھ اور، منھ پہ ممانی سمجھ گئی؟
چیلیں تو کیا، گدوں کے وہ کاٹے ہوئے ہیں کان
اُس کے پروں کی آنچ سے جلتا ہے آسمان

سیلون تک یہاں سے تو اُس کی ہے اک اُڑان
ہشیار رہ، بڑی ہی وہ لنکا ہے میری جان
تھگلی لگاتی رہتی ہے وہ آسمان پر
اللہ میرا صبر پڑے اُس کی جان پر

ہاں اس سے تو میں خوش ہوں کہ کاٹی ہو تو نے جیل
لیکن شگون بد ہے، روپے کی یہ ریل پیل
تو کچھ دنوں سے کھیل رہی ہے عجیب کھیل
بیٹا، مہاجنوں سے مناسب نہیں یہ میل

اتنا قریب ہو کے بھی پہچانتی نہیں
ان کے دلوں میں کھوٹ ہے تو جانتی نہیں

جنگ و وبا، قحط سے یہ کھینچتے ہیں زر
ٹکسال ان کے حق میں ہے میدانِ شور و شر
اوروں کی لاغری ہے! انھیں فربہی کا ڈر
یہ دوسروں کو لوٹ کے بھرتے ہیں اپنا گھر

یہ نفع خور کوئلے تک کو چراتے ہیں
حد ہے برہنگی سے یہ خلعت بناتے ہیں

یہ ان کے ہاتی دانت کے سامان، الاماں
ان میں ہیں بے شمار غریبوں کی ہڈیاں
یہ اُن کے طاق میں ہے جو مشعل قمر چکاں
اس میں ہے کتنے سینوں سے اُٹھتا ہوا دھواں

روشن اسی سے ان کے دلوں کی صفائی ہے
کتنی لویں چُرا کے یہ مشعل بنائی ہے

رسم ان حرام خوروں سے یہ کیا جنون ہے
جن کا ضمیر کج، متعفّن بطوُن ہے
مبنی فسادِ خلق پہ جن کا سکون ہے
جن کی ہر اشرفی میں غریبوں کا خون ہے

اوروں کی بھوک سے ہیں یہ روٹی لیے ہوئے
دنیا کی پیاس سے ہیں یہ پانی پیے ہوئے

ان کا محل ہے خاک کی چھاتی پر ایک سِل
ان کا چراغ تیرگیٔ بزمِ آب و گِل
محلوں میں ہل رہے ہیں یہ پردے جو متصل
ان میں دھڑک رہے ہیں مصیبت زدوں کے دل

ان کے لبِ زبوں پہ جو نَے ہے دھری ہوئی
اُس میں بلاکشوں کی ہیں آہیں بھری ہوئی

ہوتا ہے ان نگوڑوں کا جَل اور اَن خراب
پاپی ہیں ان موؤں کا ہے دان اور دھن خراب
ان سب کا تن خراب ہے، ان سب کا من خراب
ان کی نظر خراب ہے، ان کا چلن خراب

دیکھ ان سے اب نظر بھی ملانا تو قہر ہے
ان کا لہو سفید ہے چاندی کے زہر سے

دریا دلی سے آج تو یہ دے رہے ہیں دام
کل تجھ کو حکم دیں گے کہ اب آ ہمارے کام
مزدوروں کے جلائے نہ تو نے اگر خیام
یہ لوگ منہ پہ تجھ کو کہیں گے نمک حرام

کل ان کے موٹروں کے مزے خوب آئیں گے
خود تجھ کو جب یہ اپنی سواری بنائیں گے

یہ کون سی ادا ہے، ذرا سوچ میری جاں
غیرت کے مارے میری سلگتی ہیں ہڈیاں
ہر صبح لکھ پتی ہے کوئی تیرا میزباں
ہر شب کسی کروڑ پتی کی ہے میہماں

کیوں تیرے قدرداں ہیں یہ سوچتی بھی ہے
کیوں تجھ پہ مہرباں ہیں یہ سوچتی بھی ہے

ہر ان کی چیز قرض ہے، ہر شئے ادھار ہے
جو بوجھ اُتر رہا ہے وہ اک تازہ بار ہے
ایک ایک قطرہ وقفِ حساب و شمار ہے
"خونِ جگر ودیعتِ مژگانِ یار" ہے

دے گی بڑا معاوضہ اس نان و آب کا
دن ہوگا روزِ حشر ہے، بڑھ کر حساب کا

ایک ایک جھن جھنی کوڑی یہ جاتی ہے ان کی جان
رکھتے نہیں ہیں مفت کسی کو یہ میہمان

تو جانتی ہے مفت کی ہے سب یہ مان دان؟
کھاتوں پہ چڑھ رہا ہے اری ایک ایک پان
تجھ سے جو ملنے آتے ہیں تیری جناب میں
ٹلکتی ہے ان کی لونگ بھی تیرے حساب میں

تکیہ تو لاجواب ہے یہ قرض کا ستون
ہاں خوب ہے اُدھار کا یہ دلنشیں سکون
پر اس کو یاد رکھ کہ یہ اچھا نہیں شگون
کل دے گی اس کے سود میں محنت کشوں کا خون

بی پی کے سود تیری حکومت کے دور میں
مانگیں گے "اصل" صورتِ قانونِ جور میں

باتوں سے تیرے موت غریبوں کی آئے گی
تو ہر روش پہ سات مہاجن کے جائے گی
اس کو صدا بڑھائے گی، اس کو گھٹائے گی
ظاہر ہے جس کا کھائے گی اس کا بجائے گی

یہ بنئے، اُنگلیوں پہ تجھے کل نچائیں گے
اپنی ملوں میں تجھ سے یہ جھاڑو دلائیں گے

اس چال میں بگاڑ ہے، یہ چال ہاں نہ چل
جس نے چلی یہ چال گرا بس وہ منھ کے بل
کیوں کھا رہی ہے دولتِ لالہ کروڑ مل
ایک ایک پائی دیکھ اُگلنا پڑے گی کل

تو جانتی ہے سرخیٔ مے بن کے نکلے گا؟
لالہ کا سونا، خون کی قے بن کے نکلے گا؟

اور لیگ سے بتا تو یہ کیا آنا کانی ہے
چھوٹوں کی ضد، بڑوں نے ہمیشہ سے مانی ہے
اس چھوکری کی تو ابھی الھڑ جوانی ہے
تو، آنکھوں خاک، سن میں بڑی ہے، سیانی ہے

کہتی نہیں کہ لعل و گہر اُس کو بخش دے
جو گھر وہ مانگتی ہے، وہ گھر اُس کو بخش دے

دنیا میں سب کو فکر بقائے زباں کی ہے
دل میں لگن تحفظِ نام و نشاں کی ہے
دھن سب کو ایک حلقۂ امن و اماں کی ہے
حاجت ہر ایک فردِ بشر کو مکاں کی ہے

تو کہہ رہی ہے اس کی ضرورت نہیں کوئی
جز اس کے زندہ رہنے کی صورت نہیں کوئی

اس کے علاوہ یوں بھی تو ہے زندگی وبال
تم دونوں ہی کی رہتی ہیں آنکھیں ہمیشہ لال
بہنیں ہیں ہم، کبھی تمھیں آتا نہیں خیال
جب دیکھو بٹتی رہتی ہے بس جوتیوں میں دال

بک بک ہے، چل پخے ہیں، رموزیں ہیں، نوچ ہے
دن رات طعنے تشنے ہیں، گالم گلوچ ہے

ہنسنے پہ تم میں جنگ ہے، رونے پہ جنگ ہے
پانے میں تم میں جنگ ہے، کھونے پہ جنگ ہے
سینے پہ جنگ، تاگا پرونے پہ جنگ ہے
پانی پہ جنگ، پوتڑے دھونے پہ جنگ ہے
جس سے کہ دیدے لال ہیں اور منہ طباق ہے
ایسے نگوڑے وصل سے، بہتر فراق ہے

تو میل چاہتی ہے تو یہ میری بات مان
ہوتا ہے جڑ فساد کی مشترکہ خاندان
تو چاہتی ہے دونوں کا ہو ایک ہی مکان
وہ سونا جائے بھاڑ میں جس سے کہ ٹوٹیں کان
ہو گی جدا تو ہو گا مزے سے نباہ بھی
نکلے گی تم میں اس سے محبت کی راہ بھی

ہاں لیگ کو بھی حق ہے کہ وہ اپنا گھر بنائے
بچوں کو اپنے، اپنی زباں، اپنا فن سکھائے
حسب مراد اپنی تمناؤں کو جگائے
اپنے محل کے طاق میں اپنے کنول جلائے
تانوں کو اپنے ڈھب سے گھٹا اور بڑھا سکے
اس کی پسند کے ہیں جو گانے وہ گا سکے

میں خوب جانتی ہوں کہ ہے کیوں یہ ڈھیل ڈھال
پہچانتی ہوں خوب کبیرا تری یہ چال

پڑ جائے گا بچھڑ کے صغیرا کے گھر میں کال
کیا دھوپ میں سفید ہوئے ہیں مرے یہ بال
پتھر کی طرح سخت ہوں ڈھیلا نہیں ہوں میں
چند لانے مجکو بیٹھی ہے، کھیلا نہیں ہوں میں

اچھی نہیں ہے دیکھ یہ آپس کی دشمنی
چھوٹی بہن ہے تیری قیامت کی کٹ کھنی
کچھ روز تک جو اور رہے گی تنا تنی
سُن لے کہ رنگ لائے گی کل یہ کٹا چھنی

دانا نہیں جو خود کو بلاؤں میں راندھ لے
اس میرے منہ کی بات کو پلّو میں باندھ لے

"چھوٹی کی ہٹ غلط ہے" یہ باتیں ہیں واہیات
دشمن کی ہے وہ دوست یہ ہے دھاندلی کی بات
وہ بات کر کہ مجھ کو ملے قید سے نجات
اس میرے بوڑھے چونڈے کی عزت ہے تیرے ہات

دل اس کا دور یار کہیں چاک ہو نہ جائے
دھڑکا ہے یہ کہ لاکھ کا گھر خاک ہو نہ جائے

بنتی ہے جیسے بجرے ہیں کیوں اس قدر بچیت
جو اپنی چیز مانگے وہ ٹھہرے ترا پٹیت
بس تو ہی ایک شاہ ہے، چھوٹی نری ڈکیت
آنکھوں میں گھس رہی ہے اری جوتیوں سمیت

ٹھیکری بجے گی، تھوکے گی دنیا یہ جان لے
ٹھڈی میں ہات ڈال کے کہتی ہوں مان لے

خود دیکھ اپنے اُس کے ترانوں میں اختلاف
وہموں میں اختلاف، گمانوں میں اختلاف
قصّوں میں اختلاف، فسانوں میں اختلاف
لہجوں میں اختلاف، زبانوں میں اختلاف
ہو ایک ہی روش پہ مگر چال اور ہے
گو مائیکا تو ایک ہے سسرال اور ہے

وضع و طریق و حرف و حکایت، شگون فال
اندازِ نطق، طرزِ عمل، جادۂ خیال
رسم و رواج و دین و روایات، قیل و قال
اُٹھ، بیٹھ، بات چیت، لب و لہجہ، چال ڈھال
تم میں ہر ایک چیز جُدا، ہر چلن جُدا
دونوں کے پھول پات جُدا ہیں، چمن جُدا

تو شہدِ آب و گنگ و جمن ہے پیے ہوئے
اُس کا سبو ہے زمزم و کوثر لیے ہوئے
دیدوں سے آسمان کے لب تو سیے ہوئے
وہ اس زمین پر ہے حکومت کیے ہوئے
یہ تو غلط کہ اس کی ضرورت نہیں کوئی
پر ساتھ رہنے کی ابھی صورت نہیں کوئی

ملتا نہیں ہے لیگ سے تیرا طریق و طور
ہے داہنے سے بائیں وہاں مے کشی کا دور
موٹی سی ہے یہ بات ذرا کر تو دل میں غور
اس کا مزاج اور ہے تیرا مزاج اور
پھل صبح و شام پھوٹ کا چکھنے سے فائدہ؟
چھوٹی بہن کو گھونٹ کے رکھنے سے فائدہ؟

چھائی ہے تیرے باغ پہ بدلی نہ چھائے گی
منھ پر ترے مٹھاس نہ آئی نہ آئے گی
چھوٹی بہن مراد نہ جب تک کہ پائے گی
بٹیا یہ روز روز کی کِل کِل نہ جائے گی
ہر نہج سے غلط کہ حضوری ہی خوب ہے
قربت میں ہو فساد تو دوری ہی خوب ہے

چلتی نہیں ہے ایک ہی ڈھرّے پہ زندگی
اک وضع پر نہیں ہے مدارِ غم و خوشی
میرا یہ تجربہ ہے کہ ہر بعد عارضی
بنتا ہے ایک دن سببِ قربِ دائمی
ہر بعد موڑتا ہے عداوت کی دھار کو
دھو دیتا ہے فراق غموں کے فراق کو

لیگ سے خطاب

اودھر ہاں، یہ کیا قرینہ ہے اے لیگ اِدھر تو آ
رہتا ہے تیری بزم میں کیسا یہ جمگھٹا

یہ طور اِک آنکھ بھی مجھے بھاتا نہیں ترا
یہ رنگ رلیاں اور امیروں سے واہ وا
اُن کا سفینہ اور تری پاک رود میں
جو بدگہر پلے ہیں حکومت کی گود میں
ٹوٹے دلوں کو مہر و محبت سے جوڑ دے
دشمن کا جو رفیق ہو اس کو جھنجھوڑ دے
جس رشتے میں ہے جی کا زیاں اس کو توڑ دے
"نوابوں اور سروں" سے یہ دھمال چھوڑ دے
دیکھ آنکھیں کھول کر یہ ترے کام کے نہیں
یہ کفر کے غلام ہیں اسلام کے نہیں
محروم ہیں یہ خُلق کے ابرِ مُطیر سے
زہریلی بھاپ اُٹھتی ہے ان کے خمیر سے
شب اخذِ ہول کرتی ہے ان کے ضمیر سے
پتھر کے بن چکے ہیں یہ لمسِ حریر سے
وہ اِک وبا ہیں دائرۂ قدر و جبر میں
رہتے ہیں جو مسہری و موٹر کی قبر میں
دروازے جن کے رہتے ہیں مخلوق پر بھڑے
بڑبولے، بکّی، نڑیئے، گپّی، نِٹل نِڑھے
ضدی، زباں دراز، زبوں عقل مرچڑے
بے مغز، بدلگام، زبوں، سر پھرے بیرڑے

مُردار خواریوں کے بڑے معتقد ہیں یہ
ورثے کے ڈھورسے جو پلے ہیں وہ گدھ ہیں یہ

اُف یہ "سرانِ" خودسرو خانانِ بدلگام
رہتے ہیں مست جام ہوس سے یہ صبح و شام
عزت پہ حرف لاتے ہیں ان کی گرہ کے دام
اوباش مردودُں میں بہو بیٹیوں کا کام
ان کی گلی سے ہو کے گزرنا بھی عیب ہے
ان کے موئے پڑوس میں مرنا بھی عیب ہے

بھڑوؤں کے ہیں یہ دوست، حکومت کے خوشہ چیں
دیکھو تو حُر، چھوؤ تو غلامانِ کمتریں
سینوں میں جُبن جسم پہ شیروں کے پوستیں
تیرے تو کیا جز اپنے، کسی کے بھی یہ نہیں
لاکھوں ہی بزدلی کے ہیں بچّے جنے ہوئے
بیٹھے ہیں یہ جو "خان بہادر" بنے ہوئے

اور ہاں ادب کا نقش مٹاتا نہیں کوئی
تہذیب کا منار اگراتا نہیں ـــ کوئی
حرفِ زبول زبان پہ لاتا نہیں کوئی
اپنے بڑوں کے منہ کبھی آتا نہیں کوئی
چھوٹوں میں سرکشی کی نہ بو باس چاہیے
اپنی بڑی بہن کا تجھے پاس چاہیے

چھوٹے بڑے کا دھیان رہے خاندان میں
آنے نہ دے ذرا بھی کمی مان دان میں
روشن ادب کا نام ہے دنیا جہان میں
بیٹی اگر مزا ہے تو میٹھی زبان میں

چھوٹی ہے تو، غلط ہے کہ یوں تن کے بات کر
بھل منسئی سے چھوٹی بہن بن کے بات کر

ہاں کانگریس کو آئے گی اور عقل آئے گی
اک روز تجھ کو بڑھ کے گلے سے لگائے گی
منہ مانگی ہر مراد مری جان پائے گی
وہ آج مانتی نہیں، کل مان جائے گی

لڑکی، کوئی سواد نہیں اس ڈھٹائی میں
بلی بھی منہ پہ رکھتی ہے پنجہ لڑائی میں

ہاں ٹھیک، گھر کو آگ لگانا نہ چاہیئے
اپنوں کو بیچ ہے غیر بنانا نہ چاہیئے
سسرال سے نگاہ پھرانا نہ چاہیئے
پر مائکے کا حق بھی بھلانا نہ چاہیئے

منہ اُس سے پھیرے بیٹھی ہے کب سے لڑی ہوئی
جس مائکے میں نال ہے تیری گڑی ہوئی

جاری رہیں گی یونہیں جو ہر آن دھمکیاں
اُلجھی یونہیں رہے گی جو ناقوس سے اذاں

قینچی کی طرح چلتی رہے گی اگر زباں
کرتی رہے گی سیدھی فرنگی کی جوتیاں
مر کر بھی زندہ راگنی چھیڑی نہ جائے گی
گردن کا طوق، پاؤں کی بیڑی نہ جائے گی

کمیونسٹ سے خطاب

اور تو اُداس اُداس ہے کیوں کمیونسٹِ لال
صورت دھواں دھواں ہے تو اُلجھے ہوئے ہیں بال
ہے ہے یہ کمسنی کا زمانہ، یہ زرد گال
تو جوتیاں بنائے تو حاضر ہے میری کھال
کیوں سرخیوں کی دھار ہے بیٹا مڑی ہوئی
کیسی ہوائیاں ہیں یہ منہ پر اڑی ہوئی
میری تو، تو ہی سیف ہے تو ہی مرا قلم
تو سب سے بڑھ کے عقل میں ہے، سن میں سب سے کم
بہنیں اگر نہیں تو نہ ہوں مائلِ کرم
تو اُف نہ کرنا، دیکھ مری جان کی قسم
جھکتے ہیں ماں سمجھ کے اکڑتے نہیں ہیں بھائی
بہنوں کی جھڑکیوں پہ، بگڑتے نہیں ہیں بھائی
تو یوں اُداس ہوگا تو کیسے چلے گا کام
گردش میں کیسے آئے گا تہذیبِ نو کا جام

کیونکر بنیں گے خاک کے ذرّے ستارہ فام
اُٹھ اور شعلہ بار ہو اے طفلِ نم خرام
ساونت وہ ہیں رن میں علم اپنے گاڑ کے
رکھ دیتے ہیں جو شیر کے کلّے کو پھاڑ کے

تو گھر کے خستہ حال غریبوں کا غم گسار
تو سرکشوں کے حلق پہ شمشیر آبدار
تو تشنہ جاں زمیں کے لیے بدل آبشار
مظلوم کا سکون تو ظالم کا انتشار
طوفاں کا تیرے ابر سیہ کوہسار پر
تو موت کا تمانچہ رخِ شہریار پر

تیرا شگوفہ زار نیا، بوستاں نیا
تیرا نشانِ راہ نیا، کارواں نیا
تیرا طریقِ فکر نیا، ارمغاں نیا
تیری زمیں نئی ہے، ترا آسماں نیا
لپٹیں ترے دماغ میں پاکیزہ رائے کی
بُو تیرے پاس اونٹ کی ہے اور نہ گائے کی

شعلے تری نگاہ سے بن جائیں گے سحاب
پژمردگیٔ شیب پہ کھل جائے گا شباب
محنت کے زرد اُفق سے بصد شانِ انقلاب
اُبھرے گا ایک روز ترا سرخ آفتاب

گُندھنے پہ ہے شعاعوں کا سہرا ترے لیے
پھر سے جوان ہوگی زلیخا ترے لیے

جلد آئے وہ گھڑی کہ مرا پاسباں ہو تو
میرے چمن میں موجۂ آبِ رواں ہو تو
نورِ زمین و مشعلۂ آسماں ہو تو
میری جبیں کا انجمِ گوہر فشاں ہو تو

ہاں اپنے سر پہ لال پھریرا اڑائے تو
ماں کے برہنہ ہاتھوں میں کنگن پنہائے تو

اس کا مگر خیال رہے وقتِ سرخوشی
خُم میں نئی شراب ہو، ساغر رہیں یہی
میری ہی کنگھیوں سے بنے زلفِ زندگی
میرے ہی جملہ ساز ہوں میری ہی راگنی

تازہ ہوں اصطلاحیں مقولے یہی رہیں
شاخیں نئی ضرور ہوں جھولے یہی رہیں

مٹ جائے جبکہ نام و نشاں تخت و تاج کا
ہاں بھولنا قوام نہ اپنی سماج کا
کل کی جبیں پہ نقش ہو اک گونہ آج کا
دستورِ نو میں رنگ ہو میرے مزاج کا

پردیسیوں کی بوتلوں میں ڈاٹ ہو تری
کپڑا تو روس کا ہو مگر کاٹ ہو تری

ہاں غم کشوں کے ضعف پہ جانا نہ میری جاں
یہ زرد یاں ہیں تشنگیٔ خونِ مقبلاں
آہن کا کارخانہ ہیں بشگستہ ہڈیاں
غلطاں ہیں اِن کے گرم پسینے میں بجلیاں
دیکھے گا سرفرازوں کی نبضیں رُکی ہوئی
جس وقت سیدھی ہونگیں یہ کمریں جھکی ہوئی

کہتی ہوں پھر یہ دھیان رہے تجکو ماں نثار
آئے مری زبان میں نویدِ کشودِ کار
جب محفلِ جدید میں ہو جشنِ نو بہار
جنبش میں آئیں میری ہی سارنگیوں کے تار
شامِ اودھ کی انکھڑیوں میں رس یہی رہے
بیٹا نسیمِ صبحِ بنارس یہی رہے

پلیوں میں بڑھ کے خیر سے جلدی جواں ہو تو
اے لال کب سے ہے تیرے سہرے کی آرزو
گھر اپنے لاؤں بیاہ کے میں چاند سی بہو
گھوڑے پہ تو چڑھے تو بڑھے میری آبرو
چٹکے تری کلی تو پھبک جائے تن مرا
بھیگیں تری مسیں تو ہرا ہو چمن مرا

اپنی دُلہن کو پنجۂ لنکا سے دے نجات
اُٹھ اور اُٹھ کے پھونک دے راون کی کائنات

آنکھوں میں آگ رُخ پہ ہو آہن شکن ثبات
اور ہو زباں پہ نعرۂ با قوّت، و حیات
بیٹا وہ رَن پڑے کہ زمیں کانپنے لگے
کیسی زمین، چرخِ بریں کانپنے لگے

میری دعائیں جب تجھے دولہا بنائیں گی
برسے گا نور ڈومنیاں گیت گائیں گی
بچوں کے غُل میں سالیاں جوتے چُرائیں گی
بہنیں بھی نیگ مانگنے اُس وقت آئیں گی
سمجھوں گی مجھ پہ حق کا یہ احساں بڑا ہوا
دیکھوں گی تجھ پہ اُن کا جب آنچل پڑا ہوا

اپنی نئی شراب سے دنیا کو مست کر
فاتح کو جلد صیدِ زبونِ شکست کر
اپنے شکاریوں کے ارادوں کو پست کر
کیوں دوڑتا ہے شیر کی مانند جست کر
شعلے کی طرح گرم فضا سے بھڑک کے گر
بجلی ہے تو سپاہِ عدو پر کڑک کے گر

اُٹھ اور ہلا کے رکھ دے یہ میدانِ ہست و بود
اغیار کو پیامِ عدم دے ترا وجود
بیٹا ذرا بھی خون میں آیا اگر جمود
کہتی ہوں صاف صاف کہ بخشوں گی میں نہ دُودھ

اُٹھ، خونِ انقلاب کا کس بل لیے ہوئے
آندھی کا شور آگ کی ہلچل لیے ہوئے
رانی مٹکتی پھرتی ہے پہنے ہوئے کڑے
چھینے ہیں اُس نے مجھ سے ہی یہ سب کڑے چھڑے
دُکھ مجھکو اس موئی نے دیے ہیں بڑے بڑے
مردار کو نکال دے گھر سے کھڑے کھڑے
لازم نہیں کہ تیر و تبر سے نکال دے
پر ناک چوٹی کاٹ کے گھر سے نکال دے
اُٹھ، اور ان جمود کے پودوں کو جھوڑ دے
ہلچل سے ـــــ ولولوں کی زمینوں کو گوڑ دے
بڑھ اور طوق کاٹ دے، زنجیر توڑ دے
رختِ شہاں پر آگ کا دامن نچوڑ دے
ہاں جا، عرق سے اپنے گڑھے پاٹتا ہوا
اور آ، پسینا لو کے لہو کاٹتا ہوا
تا کے یہ بھوک پیاس یہ بیماریاں یہ کال
کب تک یہ بے حیائی، یہ ذلت، یہ انفعال
سر سے کفن کو باندھ کے لے ہات میں کدال
چاندی کی بارگاہ پہ لوہے کا عکس ڈال
محلوں کی سنگ بستہ کلائی مروڑ دے
قبّوں کو اُٹھ، حباب کی مانند توڑ دے

تیری گرہ میں فتح و ظفر ہے یہ جان لے
ترکش میں تیر دوش پہ بھاری کمان لے
لڑنا ہے مجھ کو موت سے دل میں یہ ٹھان لے
دانتوں پہ دانت بھینچ لے، سینے کو تان لے
رنگِ عدو کی تیغ کے پانی میں گھول دے
ہاں آستیں اُلٹ کے پھریرے کو کھول دے
اللہ ری موجِ آتشِ آہنگِ نوجواں
اُٹھتا ہے جس کے سائے میں شبنم سے بھی دھواں
جنبش میں جب شباب کا آتا ہے کارواں
دشت و جبل کی بولنے لگتی ہیں ہڈیاں
طوفاں پہ بند باندھ کے پانی کو روک لے
کس کی مجال ہے کہ جوانی کو روک لے

۱۹۴۵ء

لہ سنبل و سلاسل - ص ۲۳ -
لہ آزادی

لیلائے آزادی سے

گوش بر آواز ہیں ناواردانِ انجمن!
زحمتِ یک حرفِ تازہ اے بتِ شیریں سخن
زندگی کو صبح دے اے مشعلِ شیریں نما
ایک مدت سے شب افشاں ہے زمیں پر اہرمن
کاکلِ درہم گاں کو برہم کر کے دنیا کو بتا
یہ کہ یہ ہستی ہے پیہم دعوتِ دار و رسن
جس سے شاخیں جھومنے لگتی ہیں کھِل جاتے ہیں پھول
پھر وہی موجِ سخن اے چشمۂ ظرفِ چمن
زیست کی آہ و فغاں سے پھر ہے کانوں میں خراش
مسکرا کر پھر اٹھا لے بربطِ گل پیرہن
ناز سے اٹھلا رہے ہیں ہر روشِ پر زشت رو
کس طرف ہے اے بتِ لبتاں جبین و سیم تن
باغ پر چھائے ہوئے ہیں خادمانِ خار و خس
اب تو در آ باغ میں اے خسرِوِ سروِ چمن
اس طرف بھی اک نظر اے مہرِ بزمِ صبح گاہ
مدتوں سے تیرگیٔ شب ہے صدرِ انجمن
ہو چکا دورِ صبوحی، ساقیٔ رنگیں مزاج
ہات میں تلوار دے کر، دوش پر رکھ دے کفن

اذنِ تبلیغِ محبت دے نگاہِ ناز کو
گامزن ہیں جادۂ نفرت پہ شیخ و برہمن
زندگی و سربلندی کا دلوں کو درس دے
اے بہ لب آبِ حیات و اے بہ قد سروِ چمن
ترک فرما یہ خموشی، چاک کر دے یہ نقاب
اے لبِ ساقی شکار و اے رخِ مینا شکن
دستخط کر دے جدید آئین کے فرمان پر
یہ ہے قرطاس و قلم، اے ناسخِ شرعِ کہن
ٹوٹ جائے سبحہ و زنّار کا بندِ گراں
کھول دے ہاں دوش پر زلفِ شکن اندر شکن

قدر فرما جوشؔ کی لیلائے آزادیٔ ہند
یہ گدائے راہ ہے سلطانِ اقلیمِ سخن

(نومبر ۱۹۴۵ء)

۱؎ سنبل و سلاسل - ص ۱۲۶ -

تثلیثی فریب[1]

چھری دبائے ہوئے ہیں بغل میں اہلِ مشن[2]
شفیق بن کے مگر مسکرائے جاتے ہیں

فقیر برہنہ سے ہو رہے ہیں راز و نیاز
جناح اور جواہر منائے جاتے ہیں

وہ "فتنہ ساز" جو کل تک تھے جیل کی خوراک
وہ آج جیل کے درباں بنائے جاتے ہیں

جو سر کبھی نہ جھکے تھے جلالِ شاہی سے
حضورِ حضرت ویول جھکائے جاتے ہیں

وہ والیانِ ریاست جو ننگِ عالم ہیں
نظر بچا کے گلے سے لگائے جاتے ہیں

سرِ نیاز کو سہلا رہے ہیں ناز کے ساتھ
مگر غریب کے بھیجے کو کھائے جاتے ہیں

پڑی ہوئی ہے جہاں خار و خس پہ چادرِ گل
وہ سبز باغ ہمیں پھر دکھائے جاتے ہیں

سرِ حیات پہ چپکے سے رکھ کے کوہِ گراں
گلہ سے کاہ کے ریشے ہٹائے جاتے ہیں

بہت بڑے ہیں "خدا" کے وکیل گاندھی جی
مگر فریب میں شیطاں کے آئے جاتے ہیں

بجا رہے ہیں بلندی پہ سازِ آزادی
"وٹو" کی ہانک بھی لیکن لگائے جاتے ہیں
ہر ایک لٹ میں بٹی جا رہی ہیں زنجیریں
نئے اُصول سے گیسو بنائے جاتے ہیں
مدبّرانِ کہن سال کو بہ رغبت
طرح طرح کے کھلونے دکھائے جاتے ہیں
دیارِ ہند میں گوروں کی فوج کے ہوتے
سریرِ امن پہ کالے بٹھائے جاتے ہیں
سروں پہ لطف کے برسائے جا رہے ہیں پھول
دلوں پہ مہر کے سکّے بٹھائے جاتے ہیں
زباں پہ جن کی لگائے گئے تھے قفل کبھی
فسانہ کہنے کی خاطر بلائے جاتے ہیں
خدا کی شان جو باغی عدوئے سلطاں تھے
وزیر نائبِ سلطاں بنائے جاتے ہیں

اگرچہ پہلوئے ذم ہے مگر بقولِ جگر
"ہم اُن میں اور وہ ہم میں سمائے جاتے ہیں"

لہ سنبل و سلاسل - ص ۱۵۵-

عارضی حکومت کے حلفِ وفاداری پر

دو نعرے

جیل کے اندر اور جیل کے باہر

(۱)

جیل کے اندر

ہاں میں باغی ہوں وہ باغی برق دوز و شعلہ باف
سانس جس کی ڈالتی ہے طاقِ کسریٰ میں شگاف
ہاں وہ باغی ہوں وہ باغی فاتح مرگ و حیات
کانپتی ہے عزم سے جس کے بنائے کائنات
ہاں وہ باغی ہوں وہ باغی مرکزِ برق و شرار
جس کے آگے چھوٹنے لگتی ہے نبضِ شہریار
ہاں وہ باغی ہوں کہ سُن کر جس کا حرفِ انقلاب
چغد نوبت می زند بر گنبدِ افراسیاب
موت گر پڑتی ہے میرے سامنے کھا کر پچھاڑ
میری ٹھوکر کے تصور سے لرزتے ہیں پہاڑ
آسمانِ بے کرہ ٹیں وہ انقلابی راگ ہوں
جس نے لنکا کو جلا ڈالا تھا میں وہ آگ ہوں
"رخصت اے زنداں جنوں زنجیر در کھڑکائے ہے
خردہ تاج و تخت پھر ٹھوکر مری کھجلائے ہے

(۲)

جیل کے باہر

عزمِ سنگینِ شکستِ بابِ زنداں کی قسم
حریت کے جذبہ ہائے شعلہ افشاں کی قسم
نامور اجداد کے خونِ شرافت کی قسم
اپنی خودداری کی سوگند، اپنی عزت کی قسم
ہاں قسم کھاتا ہوں میں ٹیپوئے عالی جاہ کی
ہاں قسم کھاتا ہوں میں قبرِ بہادر شاہ کی
ہاں قسم کھاتا ہوں میں اُس فاقہ کش بنگال کی
روح جس کی سو رہی ہے چادر اوڑھے کال کی
آج بھی ہیں سرخیاں جس میں دلوں کے داغ کی
ہاں قسم کھاتا ہوں اُس جلیان والا باغ کی
عزمِ رانی کی قسم اور روحِ جھانسی کی قسم
ہاں بھگت سنگھ اور اُس "باغی" کی پھانسی کی قسم
حشر تک خادم رہوں گا دیوِ استبداد کا
جارج کی اولاد، اور اولاد، در اولاد کا
والیانِ ملک سے کبھی میں نہ ہوں گا بدلگام
باپ کا چاکر رہوں نہ گا اور بیٹے کا غلام
"ٹل" کے آقاؤں کا بھی یاور نہ ہوں گا حشر تک
چٹکیاں لیتا ہے میرے خون میں جس کا نمک

آبِ زر سے لکھے گی تاریخ یہ دن آج کا
آج سے ہوں بندۂ بے دام تخت و تاج کا
کیوں نہ سکہ ہند میں ہو بے دھڑک جاری مرا
شاہ کے نطفے سے ہے عہدِ وفاداری مرا

فرشِ پا انداز شہ کو دیر ہونا تھا مرا
شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا مرا

لہ سنبل و سلاسل ۔ ص ۲۸۳ ۔

ڈاکٹر عصمت ملیح آبادی نے اپنی خوبصورت
تحریروں سے اردو کے نئے لکھنے والوں میں
اپنی ایک منفرد جگہ بنائی ہے۔
جوش کی نظموں میں رومانی عناصر پر عصمت
نے صرف پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کی ڈگری ہی
حاصل نہیں کی ہے بلکہ اس کام کو کچھ اس
خوش اسلوبی سے انجام دیا ہے کہ جوش کے
شعری کارناموں کے کچھ اہم راز منکشف ہوئے
ہیں۔ جوش کی رومانی رباعیات کے بعد
جوش کی انقلابی تخلیق ڈاکٹر عصمت
کی دوسری پیشکش ہے جوش کے پرستاروں
کے لئے۔

[illegible]